انجمن ترقی پسند مصنفین
پاکستان میں
اسلامی روشن خیالی یا اشتراکی ملائیت
فتح محمد ملک

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان میں

فتح محمد ملک

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

انتساب

انتظار حسین

کی

یاد میں

فہرست

ابتدائیہ ۷

تحریکِ پاکستان کے دوران

۱۔ سجاد ظہیر، پنڈت نہرو اور انجمن ترقی پسند مصنفین ۱۱

۲۔ سید سجاد ظہیر کی اقبال شناسی ۲۶

۳۔ پابندیٔ اظہار کی بدترین مثال ۳۶

۴۔ احمد ندیم قاسمی: تحریکِ خلافت سے قیامِ پاکستان تک ۴۱

قیامِ پاکستان کے بعد

۱۔ احمد ندیم قاسمی اور سید سجاد ظہیر ۵۷

۲۔ ڈاکٹر تاثیر کی ترقی پسند پاکستانیت ۶۲

۳۔ پاکستان مبارک! ۷۱

۴۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، پاکستان میں ۸۰

۵۔ نیا منشور اور میکارتھی ازم ۹۵

۶۔ تنظیم ختم، تحریک رواں دواں ۱۰۸

۷۔ احمد ندیم قاسمی کا تنقیدی فیضان ۱۱۳

ضمیمہ جات

۱۔ ڈاکٹر تاثیر کا خط، مولانا سالک کے نام ۱۲۳

۲۔ تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور پاکستانی ادیب ۱۲۵

۳۔ پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے نام ۱۲۹
۴۔ اقبال کے خلاف چارج شیٹ ۱۳۵
۵۔ ایک نیا شوشہ ۱۴۴
۶۔ انجمن کا پہلا منشور ۱۴۷
۷۔ نیا منشور ۱۵۴
۸۔ انجمن کے احیاء کے بارے میں استفسار ۱۵۶
دستاویزات ۱۶۰

ابتدائیہ

برصغیر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے سالہا سال پیشتر ترقی پسند ادبی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی اور منشی پریم چند کے سے تخلیق کار سامراج دشمنی اور عوام دوستی کو اپنی تصنیفات میں مرکزی اہمیت دیتے چلے آ رہے تھے۔ انجمن کے اختتام کے بعد بھی یہ تحریک رواں دواں ہے۔ ترقی پسند ادب کے موضوع پر عزیز احمد، خلیل الرحمن اعظمی اور علی سردار جعفری کی تصنیفات اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں۔ سید سجاد ظہیر اور اُن کے ہمنوا ان ہی خلاق دانشوروں کے ادبی فیضان سے تربیت پا کر اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز کے لندن میں جن ادیبوں اور شاعروں نے انجمن کی بنیاد رکھی تھی اُن میں سید سجاد ظہیر کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور پروفیسر احمد علی بھی سرگرمِ عمل رہے تھے۔ یہ لوگ ترقی پسند تو تھے مگر سوویت یونین کے اشتراکی نظام کی مکمل پیروی سے انکاری تھے۔

چند برس بعد جب برطانوی ہند میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تب یہ انجمن مختلف الخیال ادیبوں کا متحدہ محاذ تھا۔ انجمن میں مارکسی ادیب بھی تھے اور مولانا حسرت موہانی کے سے مسلمان اور منشی پریم چند کے سے ہندو ادیب بھی تھے جو انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے تصورات کو اپنے اپنے روحانی اصول واقدار کی روشنی میں عام کرنے میں مصروف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں منعقدہ بھیمڑی کانفرنس میں اشتراکی نظریہ سازوں کی جانب سے انتہاپسندی کی پالیسی کو اپنانے کا عزم باطل ہو کر رہ گیا تھا۔ میری اس مختصر کتاب کا موضوع پاکستان میں انجمن کے قیام کے محرکات وعوامل اور اختتام کے اسباب ونتائج ہیں۔

ترقی پسند ادیبوں کے پہلے کُل پاکستان کنونشن میں چونکہ کوئی حسرت موہانی موجود نہ تھے اس لیے انتہاپسندی اور مختلف الخیال ادیبوں کے بائیکاٹ کی پالیسی بہت آسانی کے ساتھ منظور کر لی گئی تھی۔ انجمن اپنے دوسرے کنونشن میں اس حکمتِ عملی کے منفی اثرات کا ادراک کر کے انتہاپسندی اور بائیکاٹ سے تائب ہو گئی تھی۔ خود احتسابی کے اس عمل کے باوجود انجمن زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

برطانوی ہند اور آزاد ہندوستان میں ترقی پسند ادب پر خوب دادِ تحقیق دی جا چکی ہے۔ میں نے اس ادبی تنقید و تحقیق سے اکتسابِ فیض کیا ہے مگر یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہا ہے کہ اس موضوع پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے اُس کا دائرہ ء کار بڑی حد تک لندن، لکھنؤ اور دیگر ہندوستانی مراکز تک محدود ہے۔ پاکستان میں ترقی پسند ادب اِن کتابوں کا مرکزی موضوع نہیں ہے اس لیے قدرتی طور پر ان میں پاکستان کے آغاز کے چند ایک سال کے احوال و مقامات کے سرسری سے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہی احساس میری اس کتاب کا محرک ہے۔

آج یہ کتاب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے وقت مجھے احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر ایوب مرزا بہت یاد آ رہے ہیں۔ میں نے اِن کی تحریروں کے ساتھ ساتھ اِن کی باتوں کی خوشبو سے بھی پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں کے مصائب و آلام کو اپنے دل میں اُتارا ہے۔ اس کتاب میں شامل چند دستاویزات خود احمد ندیم قاسمی کی عطا ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے نام چند ترقی پسند ادیبوں کے خطوط محترمہ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے فراہم کیے ہیں۔ تحقیقی مواد کی فراہمی کے لیے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر اسد فیض اور اپنے بیٹے طاہر ملک کا احسان مند ہوں۔ مختار احمد گوندل نے مسودے کی کمپوزنگ اور عزیزی افضال احمد نے اشاعت میں، حسبِ معمول، کارِ محبت سرانجام دیا ہے۔ میں تہِ دل سے ان کا احسان مند ہوں۔

فتح محمد ملک

اسلام آباد

۷ فروری ۲۰۱۶ء

تحریکِ پاکستان کے دوران

باب اوّل

سجاد ظہیر، پنڈت نہرو اور انجمن ترقی پسند مصنفین

اُردو دُنیا میں سید سجاد ظہیر اور پنڈت جواہر لال نہرو کی نظریاتی، سیاسی اور ذاتی رفاقت کبھی بھی صیغہ، راز میں نہیں رہی۔ خود اُنھوں نے اور اُن کے قریب ترین ادبی اور سیاسی رفقا نے اِس حقیقت کا برملا اعتراف کر رکھا ہے۔ سید سبطِ حسن نے لکھا ہے کہ:

> ''بنے بھائی لندن ہی میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے لیکن ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون جماعت تھی اس لیے وہ یہاں آ کر کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی دراصل کانگریس کا ایک بایاں بازو تھی۔ اس جماعت کو پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی حاصل تھی۔ سجاد ظہیر خفیہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور الہ آباد کی ریلوے مزدوروں کی یونین میں کام کرتے تھے۔ البتہ سیاسی سرگرمیوں کو وسعت دینے کی خاطر وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے خاندانی تعلقات تھے۔''(۱)

پروفیسر قمر رئیس نے جن چند حقائق کا اعتراف کیا ہے اُن میں سے ایک درج ذیل ہے:

> ''سجاد ظہیر جب تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے واپس آئے اور ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اور تنظیم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، اُس وقت کی صورتِ حال کے بارے میں اپنے ایک انگریزی مضمون میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ ایک طرف اگر وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی پر فخر کرتے تھے تو دوسری جانب وہ خوش تھے کہ جواہر لال نہرو کی حمایت سے وہ الہ آباد کی سٹی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری چن لیے گئے تھے۔ دراصل یہیں سے ترقی پسند ادبی تحریک کے کردار، اس کی نظریاتی جڑوں، قومی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں اس کے ادیبوں کے اختلافی رویوں اور کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنگِ آزادی کے متحدہ محاذ کی طرح یہ بھی ادیبوں

اور فنکاروں کا ایک متحدہ فورم تھا۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ کمیونسٹ پارٹی ادیبوں اور دانشوروں پر اپنا نظریاتی تسلط بڑھانا چاہتی تھی اور اس لیے پارٹی کے وفادار ادیب ایسے ادیبوں کی گرفت کرتے رہتے تھے جو کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی یا اس کے ڈسپلن کے پابند نہیں تھے۔"(۲)

انجمن ترقی پسند مصنفین پر کمیونسٹ پارٹی کے اسی تسلط کے اثرات ونتائج پر اظہار خیال کرتے وقت انجمن کے بانی رکن پروفیسر احمد علی لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس بڑی حد تک ایک سیاسی اجتماع تھی، اس پر ایک مخصوص سیاسی مسلک کی گہری چھاپ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن کے قیام کے ساتھ ہی تخلیقی ادیبوں کی مایوسی اور بے دلی سامنے آنے لگی تھی۔ اپنی اسی تحریر میں انھوں نے سجاد ظہیر کی تصنیف "روشنائی" کو بھی ہدف تنقید بناتے ہوئے حقائق سے بڑی حد تک دُور بتایا ہے۔(۳) ابتدائی چند برس کے دوران ہی ترقی پسند ادبی تحریک کے سکڑ سمٹ کر فقط ایک سیاسی پلیٹ فارم بن کر رہ جانے کی حقیقت کو ڈاکٹر رخشندہ جلیل کی نئی کتاب میں بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں سجاد ظہیر اور پنڈت نہرو کی ذاتی اور نظریاتی رفاقت کے اسباب ونتائج بھی نئے سرے سے زیر غور لائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر رخشندہ جلیل گذشتہ چند برس سے تراجم، تنقید اور تحقیق میں گہرے انہماک کے ساتھ اُردو کے ترقی پسند اور جدید ادب کو انگریزی میں منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔ حال ہی میں ترقی پسند ادبی تحریک کے تعارف وتجزیہ کے باب میں اُن کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ A Rebel and her Cause ڈاکٹر رشید جہاں کے تعارف اور اُن کی تخلیقات کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب A Literary History of the Progressive Writers' Movement in Urdu میں ترقی پسند تحریک کے عروج وزوال کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تیاری اور تکمیل میں رخشندہ جلیل نے جس علمی تجسس کے ساتھ تحقیق وتنقید کا حق ادا کیا ہے وہ ہمارے ہاں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ اپنے اس ادبی کارنامے کی تکمیل کی خاطر اُنھوں نے برصغیر کی لائبریریوں اور آرکائیوز کے ساتھ ساتھ انگلستان میں موجود بنیادی دستاویزات کو بھی ڈھونڈ نکالا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انٹیلی جنس بیورو، برطانوی کمیونسٹ پارٹی، انڈیا آفس کے سے اداروں میں موجود اُن خفیہ رپورٹس کی چھان بین بھی کی ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب خفیہ نہیں رہیں۔ مکمل غیر جانبداری اور سارے دستیاب مواد کے انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین سر سید احمد خان اور اُن کے نامور رفقاء سے لے کر اقبال اور جوش تک مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی انسان دوستی اور روشن خیالی کی فکری اور ادبی تحریک کا منطقی ارتقاء ہے۔(۴) یہ کیسا حسین اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں رُوس کے اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم مسٹر سے پہلے مولانا نے کیا تھا۔ رُوس کی کمیونسٹ پارٹی کے اشتراکی منشور کا پہلا اُردو ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے جریدہ "الہلال" نے شائع کیا تھا۔(۵) راقم الحروف نے اپنی کتاب بعنوان "فیض، شاعری اور سیاست" کے پہلے باب میں اس حقیقت کا اعتراف کر رکھا ہے کہ:

''رُوس میں اشتراکی انقلاب کا پُر جوش خیر مقدم کرنے والوں میں برصغیر کے علمائے حق پیش پیش تھے۔ سب سے پہلے تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت کے جلا وطن مجاہدین نے اشتراکی انقلاب میں امید اور دوستی کی بشارت پائی تھی اور پان اسلامزم کا خواب منتشر ہونے کے بعد اسلام کی آزادی اور سربلندی کی خاطر لینن کی حمایت پر انحصار کرنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ وسطِ ایشیا کے نقشبندی صوفیا اور برصغیر کے دیوبندی علما کے ذکر سے پہلے یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں اشتراکیت اور اسلام کے درمیان اصولی اور بنیادی مماثلت کے رشتے تلاش کرنے کی تاریخ انقلابِ رُوس سے بھی پُرانی ہے۔ مشیر حسین قدوائی کا انگریزی کتابچہ ''اسلام اینڈ سوشلزم'' ۱۹۱۳ء میں لندن سے شائع ہوا تھا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے اشتراکی اصولوں پر ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ قدوائی کا کہنا یہ تھا کہ ہر چند کارل مارکس کی سوشلزم محمد مصطفیٰ کی سوشلزم کی نسبت ایک غیر مکمل آئیڈیالوجی ہے تاہم یہ محدود سوشلزم بھی عہدِ حاضر کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ قدوائی جیسے جدید تعلیم یافتہ نوجوان ہوں یا مولانا برکت اللہ بھوپالی (۱۸۵۴ء۔۱۹۲۷ء) اور مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲ء۔ ۱۹۴۴ء) جیسے علمائے دین ہوں یہ سب اہلِ نظر سچے اور کھرے مسلمان پہلے تھے اور سوشلسٹ بعد میں۔ ان کے دل جمال الدین افغانی کے اتحادِ اسلامی کے خواب سے منور تھے اور ان کی آنکھیں مغربی سامراج کی تباہی میں دُنیائے اسلام کی نجات دیکھ رہی تھیں۔ ان سربکف مجاہدینِ اسلام نے برطانوی سامراج کے خلاف اپنے جہادِ آزادی میں سب طرف سے مایوس ہو کر بالآخر اشتراکی رُوس کا رُخ کیا تھا جہاں لینن نے اسلامی مشرق میں آزادی کی تحریکوں کی تائید و حمایت کا علم بلند کر رکھا تھا۔ اس دور میں اشتراکی روس کی مسلمان دوست حکمتِ عملی کی بیشتر تفصیلات مشیر حسین قدوائی کی تصنیف ''پان اسلامزم اینڈ بالشوزم'' (مطبوعہ لندن ۱۹۳۷ء) میں موجود ہیں۔ خیری برادران نے ۲۵ نومبر ۱۹۱۸ء کو رُوس پہنچ کر اشتراکی قیادت سے جہادِ آزادی ہند میں دستِ تعاون بڑھانے کی اپیل کی۔ ادھر افغانستان میں امیر امان اللہ خان کے اقتدار میں آ جانے سے ہندوستان کے جلا وطن مجاہدین پھر سے سرگرمِ عمل ہو گئے۔ لینن اور امان اللہ کے مابین دوستانہ مراسم استوار ہوئے تو مولانا برکت اللہ ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ کے سفیرِ خاص کی حیثیت سے ماسکو پہنچے جہاں انھوں نے سوویت یونین کے تعاون سے آزادی ہند کی جدوجہد مرتے دم تک جاری رکھی۔''(۶)

ایسے میں جب سید سجاد ظہیر اور محمود الظفر نے اِس ترقی پسند تحریک کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے منظم کیا

تو رفتہ رفتہ تحریک اور تنظیم کے درمیان اختلافات نمودار ہونا شروع ہو گئے - آغاز کار میں تنظیم مختلف الخیال ادیبوں، شاعروں اور سیاسی کارکنوں کا متحدہ محاذ تھی۔ بعد ازاں یہ متحدہ محاذ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ ذاتی قربت اور نظریاتی یگانگت کے حامل چند افراد کی آمریت کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔ اِس آمریت نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو آل انڈیا کانگرس کا ادبی محاذ بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب کے معمار'' میں علی سردار جعفری کا یہ اعترافی بیان شائع کیا ہے کہ ''بھیمروی کانفرنس کی قراردادوں میں جو تجویزیں منظور ہوئیں اور جو بیان شائع کیے گئے اُن میں مخصوص الفاظ کے بغیر یہ مفہوم تھا کہ ترقی پسند ادیب کے لیے مارکسسٹ ہونا ضروری ہے۔''(۷)

پنڈت نہرو اور روسی مارکسزم کے ساتھ سید سجاد ظہیر کی یہ وفاداری بشرطِ استواری سر آنکھوں پر مگر ترقی پسندی کے متحدہ محاذ میں مولانا حسرت موہانی اور پریم چند کے سے دیندار شاعروں اور ادیبوں کو زبردستی روسی سیاست کا آلہء کار بنانے کی مساعی اِس ایمان میں شدید کمزوری کی علامت ہیں۔ اپنی اِسی کتاب میں ڈاکٹر قمر رئیس نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ: ''سچ تو یہ ہے کہ اِن جماعتوں (انڈین نیشنل کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی) کے باہمی رشتوں میں نشیب و فراز کے باوجود ایک متحدہ محاذ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶ء کے الیکشن میں بھی کمیونسٹ پارٹی نے کانگرس کا ساتھ دیا''۔(۸)

اب آیئے پنڈت نہرو کے ساتھ ذاتی اور نظریاتی ہم آہنگی کی جانب۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اِس حقیقت کے کافی و شافی ثبوت مہیا کیے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا ہے کہ سجاد ظہیر اور محمود الظفر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں پنڈت جواہر لال نہرو کے معتمدِ خاص کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ جون ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور کے ایم اشرف کو نہرو کے پولیٹیکل اینڈ اکنامکس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں بطور سیکرٹری فرائض تفویض کر دیے گئے تھے۔ محمود الظفر اور اُن کی بیگم رشید جہاں تو اِس زمانے میں، دو برس تک، پنڈت نہرو کے گھر اُن کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر رہے تھے۔(۹)

رخشندہ جلیل نے بڑی دقتِ نظر کے ساتھ نو دریافت دستاویزات پر عرق ریزی سے اِس حقیقت کا اثبات کیا ہے کہ سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی خاطر نہرو خاندان سے مشاورت کے ساتھ ساتھ برطانیہ اور ماسکو کی اشتراکی جماعتوں کے ساتھ گہرے رابطوں کا عمل بھی جاری رکھا تھا۔ سٹالن نے ۲۳۔اپریل ۱۹۳۲ء کو سوویت ادیبوں کی یونین قائم کی تھی اور بعد ازاں ۱۹۳۴ء میں سوشلسٹ رائٹرز کانگرس میں انتہا پسندی کی حکمتِ عملی وضع کی گئی تھی۔(۱۰) سجاد ظہیر نے انجمن کو سٹالن کے دور کی سی تنگ نظری کا رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ رخشندہ جلیل نے اِس باب میں جن خفیہ دستاویزات کی چھان بین سے حقیقت تک رسائی حاصل کی ہے اُن میں سے ایک چشم کشا رپورٹ کے مطابق سجاد ظہیر نے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے اربابِ بست و کشاد کو اپنی نظریاتی استقامت سے متاثر کر کے رُوس کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی جلد اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ پارٹی نے سجاد ظہیر کی گوناگوں صلاحیتوں کو برصغیر میں کمیونزم کی نشر و اشاعت کے کام میں

لانا شروع کر دیا تھا۔ یوں سوویت یونین کی جانب سے سجاد ظہیر کی نظریاتی اور مالی سرپرستی کا اہتمام بھی ہونے لگا تھا۔ الہ آباد سے جریدہ New Indian Literature کے اخراجات کی مد میں ہندوستانی اور برطانوی کرنسی میں مالی عطیات بھی فراہم کیے جانے لگے تھے۔ (۱۱) مزید برآں یہ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے تصور کو عمل میں ڈھالنے کی تدابیر نہرو خاندان کی رہنمائی میں ہی سرانجام دی جاتی رہیں:

> "It is worth noting that in later years, while Zaheer talked of the PWA, of having a preliminary meeting of the PWA (long before the first AIPWA Conference) at his father's home in Allahabad which was attended by city luminaries including Vijaylakshmi Pandit, and of discussing 'his' proposal to launch a countrywide PWA with Nehru, Acharya Narendra Dev, JP, and Ramkrishna Benipuri (all of whom liked 'his' idea)."(12)

ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کی جنوری ۱۹۳۶ء کی ایک رپورٹ کو بجا طور پر انتہائی قیمتی دستاویز قرار دیا ہے جس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کو ماسکو کی تنظیم رائٹرز انٹرنیشنل کی برطانوی شاخ سے مربوط قرار دیا گیا ہے۔ اسی رپورٹ میں ماسکو کی جانب سے سجاد ظہیر کو اپنے آبائی گھر سے ایک جریدہ ''نیو انڈین لٹریچر'' جاری کرنے اور تنظیمی سرگرمیوں کے لیے مالی امداد کی فراہمی کے ثبوت بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مزید برآں انجمن کے امور کو ماسکو کی ہدایت کے مطابق سرانجام دینے پر سید سجاد ظہیر کی تحسین بھی کی گئی ہے۔''(۱۳) رخشندہ جلیل کا کہنا ہے کہ سجاد ظہیر نے روس کی اشتراکی جماعت کے ایما پر ہی انجمن کا ڈول ڈالا تھا:

> "To return to Sajjad Zaheer and the setting up of the PWA, we once again find rich pickings in the intelligence reports in the IOL. A report dated 16 April 1936 looks back at the formation of the AIPWA in London in 1934 and notes that 'the Comintern had decided to use Zaheer's talents as a writer until they had satisfied themselves about his bonafides, has been amply confirmed by information received during the past

three months'. This refers to Zaheer's efforts in organizing the first of its kind association of Indian writers across language divides."(14)

اپنے اس استدلال کی تائید مزید میں ڈاکٹر رخشندہ جلیل لکھتی ہیں کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سجاد ظہیر نے سوویت یونین میں یونین آف سوویت رائٹرز کے قیام کے فقط دو سال بعد برطانوی ہند میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی تگ و دو شروع کر دی تھی۔ لندن سے واپس ہندوستان پہنچتے ہی اُنھوں نے جواہر لال نہرو کی سرپرستی میں مختلف زبانوں کے سرکردہ ادیبوں سے روابط قائم کیے اور انڈین نیشنل کانگرس کے ۱۹۳۶ء کے سالانہ اجلاس کے مقام و محل پر ہی ادیبوں کے لکھنؤ اجلاس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں لے آئے۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے انڈیا آفس ریکارڈز کی ایک رپورٹ کو چشم کشا قرار دیا ہے جس کے مطابق سجاد ظہیر نے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے ارباب بست و کشاد کو اپنی نظریاتی استقامت سے متاثر کر کے رُوس کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی جلد ہی اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے رپورٹ کے برمحل، طول طویل مگر انتہائی اہم اقتباسات پیش کر کے اس حقیقت کے دستاویزی ثبوت پیش کیے ہیں کہ رُوس اور برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹیوں نے بہت جلد سید سجاد ظہیر کو ایک ہونہار کمیونسٹ مان لیا تھا اور اُس کی گوناگوں صلاحیتوں کو برصغیر میں کمیونزم کی نشر و اشاعت کے کام میں لانا شروع کر دیا تھا:(۱۵)

"This section has been built from IOR/L/PJ/12/430. The same file talks of the Trojan Horse Policy of the Communists in infiltrating the Congress at all levels. It gives the example of Sajjad Zaheer and of K.M. Ashraf who was appointed secretary of Nehru's new Political and Economic Information Department in June 1936. The report also mentions Zaheer distributing left-wing literature, on behalf of the AIPWA, at the Faizpur session of the Congress in January 1937. However, despite Nehru's growing disenchantment with communism and his occasional impatience with the young comrades in his own party, his relations with Zaheer and with the PWA remained cordial. In November 1937, he addressed

the PWA session in Allahabad."[16]

ہر چند انڈین کمیونسٹ پارٹی نے قوموں کے حق خود اختیاری کی رُو سے ہندی مسلمانوں کو قومی خود اختیاری کا مستحق قرار دے دیا تھا تاہم سید سجاد ظہیر اور اُن کے ہمنوا ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے۔ اپنی زیر ادارت ہفتہ وار ''قومی جنگ'' کی ۱۸۔اپریل ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں کہ: ''ضروری ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ہو اور یہ اتحاد کانگرس اور لیگ کے باہمی سمجھوتہ کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ آزادی اور خودمختاری کا انحصار اِس پر ہے کہ ہم اِس وقت مسلم لیگ اور کانگرس کا اتحاد کریں۔''[۱۷] اسی اخبار میں ''کمیونسٹ اور مسلم لیگ'' کے عنوان سے اپنے ایک اور مضمون میں وہ اپنے اِس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ:

''کمیونسٹ پارٹی ملک کے دیگر محبان وطن کی طرح کانگرس اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ ضروری سمجھتی ہے لیکن کمیونسٹ پارٹی کانگرس سے ایک قدم آگے جاتی ہے اور کہتی ہے کہ پاکستان کے مطالبہ میں حقیقت کا ایک ٹھوس عنصر موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمان بڑی اکثریت میں ہیں اور ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں ان کا حق خود اختیاری تسلیم کرنا چاہیے اگر کانگرس ایسا کرے تو کانگرس اور لیگ میں اتحاد ہو سکتا ہے اور مشترکہ قومی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ مطالبہ ، خود اختیاری کو تسلیم کرنے سے ملک میں پھوٹ نہیں پڑے گی بلکہ موجودہ پھوٹ ختم ہو جائے گی اور ایک پائیدار اور مستحکم اتحاد کی بنیاد پڑے گی...... ۔اصلیت یہ ہے کہ کمیونسٹ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے بیک وقت طرفدار ہیں اس لیے کہ ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام کی نمائندگی یہی دو جماعتیں کرتی ہیں۔ صرف کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلم عوام کی عام خواہش یہ ہے کہ اِن دونوں میں اتحاد ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری نجات کا واحد راستہ یہ نہیں ہے؟''[۱۸]

جب ''قومی جنگ'' میں درج بالا سوال اُٹھایا گیا تھا تب برطانوی ہند کے گوشے گوشے میں اس کا جواب نفی میں دیا جا رہا تھا۔ حیرت ہے کہ بڑے بلند بانگ نعروں کی صورت میں گونجنے والی یہ آواز کمیونسٹ پارٹی کے کانوں تک کیوں نہ پہنچ پائی تھی۔ اِس زمانے میں تو ''بٹ کے رہے گا ہندوستان ، بن کے رہے گا پاکستان'' ایک صدائے دل نواز بن چکی تھی۔ ایسے میں برصغیر ہند کے اتحاد کا راگ کیوں؟ اِس سوال کا جواب دیتے وقت سید سجاد ظہیر کی دختر نیک اختر ،نور ظہیر نے بتایا ہے کہ اُن کے ابا مذہبی آدمی کو ''کمپلیٹ ایڈیٹ'' سمجھتے تھے۔ لکھتی ہیں:

''مذہب ، ابا کی نظروں میں وہ نشہ تھا جس کی لت سماج کو اس لیے لگائی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی حالت کی اصلی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ جو کہیں اُسے وجہ مل گئی تو وہ اُسے مٹانے کی کوشش کرے گا۔ یہ اُن کا اپنا عقیدہ تھا جسے اُنھوں نے زندگی بھر قائم رکھا۔''[۱۹]

انھیں اپنی دہریت مبارک مگر حسرت موہانی اور پریم چند کے سے روحانیت پسند بھی تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے قابلِ فخر قائدین تھے؟ سجاد ظہیر کی اس کمیونسٹ آمریت کی موجودگی میں مختلف الخیال ادیبوں کا متحدہ محاذ کب تک قائم رہ سکتا تھا؟...... یہ تو رہی دین و مذہب کی بات۔اب آیئے قیامِ پاکستان کی جانب۔ جب اُن کی بہترین مساعی کے باوجود ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی دو مختلف اور متحارب پارٹیوں میں بٹ کر رہ گئی تب اُن کی غمگین کیفیت کی مصوری اُن کی بیٹی نے یوں کی ہے:

> ''تو...........نہیں مانے''۔
>
> ''نہیں رضیہ،نہیں مانے۔ پارٹی کے دو حصے ہونا طے ہیں۔''صدری اُتار کر وہ ایک کرسی پر چپ چاپ کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر اُٹھے اور کھڑکی پر آکر کھڑے ہو گئے، جہاں سے صبح کی پہلی کرنیں اندر پھیل رہی تھیں۔ بغیر مُڑے ہوئے وہ بولے'' جب ملک کا بٹوارا ہوا تو لگا اس سے تکلیف دہ اور کیا ہوگا۔ آج لگتا ہے، تکلیف کی شدت کے بارے میں بھی جلد بازی میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔
>
> امی کے سوال کو ابا نے بیچ میں کاٹ دیا۔''جب پارٹی کے ٹکڑے ہوں گے تو اثر تو ادیبوں پر بھی پڑے گا۔ زیادہ تر ترقی پسند ادیب کہیں نہ کہیں کمیونسٹ نظریے سے متاثر ہیں۔ اس نظریے کو بنیاد بنا کر ان کی رہنمائی کرنے والی پارٹی جب ٹوٹے گی تو وہ کیسے اچھوتے رہ سکتے ہیں؟۔''(۲۰)

درج بالا عبارت میں'' جب ملک کا بٹوارا ہوا تو لگا اس سے تکلیف دہ اور کیا ہوگا؟'' کا جملہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ سجاد ظہیر قیامِ پاکستان کو ملک کا بٹوارہ قرار دیتے ہیں۔ برطانوی ہند ایک ملک نہیں ،ایک برصغیر تھا۔ اس برصغیر میں کئی ممالک کو بزورِ شمشیر فتح کر کے شامل کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ملک ایک جداگانہ قوم کا مسکن تھا۔ مسلمان قوم کی عوامی جمہوری تحریک نے ووٹ کی پرچی کے ذریعے اپنا حق رائے دہی استعمال کر کے پاکستان قائم کر لیا تھا۔ اس لیے پاکستان کے طلوع کو ازرہِ حقارت بٹوارا کہنا انتہائی غیر مہذب ہونے کی دلیل ہے۔ اس سے بھی زیادہ غیر مہذب کارروائی بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے ایک بھارتی دانشور سجاد ظہیر کو پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری مقرر کر کے خفیہ طور پر پاکستان بھیج دینا ہے۔ انڈین کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس ۲۸ فروری سے ۶ مارچ ۱۹۴۸ء تک کلکتہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے ۶۳۲ مندوبین میں سے صرف تین مندوبین: ایرک سپرین (پنجاب)، محمد حسین عطاء (خیبر پختونخوا) اور جلال الدین بخاری (سندھ) پاکستان سے گئے تھے۔ مقامِ حیرت ہے کہ انڈین کمیونسٹ پارٹی کے اس اجلاس میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان تین پاکستانیوں میں سے کسی ایک کے بجائے ایک

بھارتی کمیونسٹ سجاد ظہیر کو پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس فیصلے کے محرکات وعوامل کی نشاندہی کامران اصدر علی نے اپنی کتاب ''سرخ سلام'' میں کر رکھی ہے:

"At the Calcutta Congress, the report on Pakistan was presented by Bhowani Sen.....The Indian Union was progressive and considered Pakistan politically reactionary. Sajjad Zaheer, a member of the Central Committee, and B. T. Ranadive, the newly elected General Secretary, answered by arguing that separate parties were needed to build a united communist movement in both territories and that both parties would coordinate in a common struggle against imperialism, feudalism, and the bourgeoisie to ensure the victory of the democratic revolution in both countries....As General Secretary of the CPP, Zaheer remained underground throughout his tenure until his arrest in March 1951 in connection with the Rawalpindi Conspiracy Case. Soon after his release in 1955, he went back to India......It was also decided that the East Bengal party would continue to be guided by the West Bengal Communist Party and retain its link to the CPI. Hence, it was only the West Pakistan party that would constitute an entirely separate entity."(21)

درج بالا اقتباس میں دو باتیں انتہائی معنی خیز ہیں۔ اول یہ کہ پاکستان پر بھوانی سین کی پاکستان رپورٹ میں انڈین یونین کو ترقی پسند قرار دیا گیا ہے اور پاکستان کو رجعت پسند۔ دوم یہ کہ کلکتہ کانگرس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی بدستور انڈین بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کی نگرانی میں کام کرتی رہے گی جبکہ مغربی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی انڈین کمیونسٹ پارٹی سے اپنی الگ شناخت قائم کرنے میں آزاد ہوگی مگر اس کا سیکرٹری جنرل انڈین ہوگا۔ سید سجاد ظہیر کی ہندوستانی قومیت اور اُن کے یوپی کے اشتراکی رفقا کے اندازِ نظر اور طرزِ عمل پر سندھ، خیبر پختونخوا اور

پنجاب کے اراکین مسلسل اور متواتر نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔اس ضمن میں کامران اصدر نے اپنی کتاب میں محمد حسین عطا کے اُس طویل خط کا حوالہ دیا ہے جو سی آئی ڈی کی فائل میں موجود ہے۔ سید سجاد ظہیر پاکستان میں اپنے قیام کے دوران روپوش رہے ہیں۔ روپوشی کے اسی عالم میں کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین میں سازشوں کے جال بُننے میں مصروف رہے ہیں۔ان سازشوں میں سب سے بڑی اور آخری سازش پاکستان میں منتخب قومی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی وہ پہلی کوشش ہے جسے ''راولپنڈی سازش ۱۹۵۱ء'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اس موضوع پر پاکستان کے ایک سابق سیکرٹری کابینہ جناب حسن ظہیر نے مستند سرکاری دستاویزات کی روشنی میں ایک قابلِ قدر کتاب لکھی ہے جس کا اُردو ترجمہ سہیل انجم نے شائع کر رکھا ہے۔ اس کتاب میں دو ابواب..... 'سازش' اور 'اشتراکی حوالہ' حیران کن انکشافات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک انکشاف یہ ہے کہ پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل سجاد ظہیر اپنی کارکردگی اور اپنے فیصلوں کے جواز پر مشتمل رپورٹ بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو پیش کیا کرتا تھا۔ مزید برآں: ''سجاد ظہیر سمیت بھارت سے آنے والے پارٹی ارکان جعلی دستاویزات کے ساتھ پاکستان پہنچے اور جعلی ناموں سے زیرِ زمین کام کرتے رہے۔ آمد سے پہلے ہی یا کچھ عرصہ بعد ان کی گرفتاریوں کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے اور انہیں اپنی شناخت، نقل و حرکت اور مسلسل بدلتی قیام گاہیں پوشیدہ رکھنے کے لیے بہت احتیاط کرنی پڑتی تھی۔'' (۲۲)

جناب حسن ظہیر نے رُوسی حکومت کی جانب سے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کے دورہ رُوس کی مسلسل بدلتی ہوئی تاریخوں کے اصل محرکات وعوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔لیاقت علی خان کے دورہ رُوس کی تاریخوں میں رُوس کی جانب سے مسلسل ادل بدل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ رُوس کی قیادت پاکستان میں فوجی بغاوت کی کامیابی کی اُمید لگائے بیٹھی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ پاکستان کی نئی قیادت سامنے آنے کے بعد دورے کی تاریخ مقرر کرے۔اس باب میں حسن ظہیر درج ذیل نتیجے پر آ پہنچے:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ اکبر خان اور بیگم نے تختہ اُلٹنے کے منصوبوں سے متعلق کمیونسٹ پارٹی سے روابط استوار کر لیے تھے۔ مختلف ممالک بالخصوص ابھرتے ہوئے نوآبادیاتی معاشروں میں روسیوں کے اثر ونفوذ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ اکبر خان کے منصوبوں کی خبر ماسکو پہنچ چکی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو ایسے موقع پر پاکستانی وزیرِاعظم کا دورہ سوویت حکومت کے لیے سخت پریشانی کا باعث بنتا جب کمیونسٹوں کی مدد سے ان کا تختہ اُلٹا جا چکا ہوتا۔ سوویت حکومت کی طرف سے اتنی گرمجوشی سے دعوت دینے اور پھر اسے واپس لینے کی کم از کم ایک تشریح تو یہی ہے۔ اس مفروضے کو پورے یقین سے قائم کرنا مشکل ہے لیکن سازش کے پروان چڑھنے اور

روسیوں کے دعوت سے جان چھڑانے کے زمانے میں اس قدر یکسانیت ہے کہ ان دونوں کارروائیوں میں ربط ضبط کا امکان مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"(۲۳)

سوال یہ ہے کہ سید سجاد ظہیر کس کے ایما پر اپنے قریب ترین ہمسایہ ملک کی تخریب کا مشن پورا کرنے میں کوشاں تھے؟ اس سوال کے جواب میں لکھتا ہوں تو ایک برطانوی دانشور کی کتاب بعنوان "The Last Days of The British Raj" میں شامل پنڈت نہرو کا ایک انٹرویو یاد آتا ہے۔ اس انٹرویو کے دوران پنڈت نہرو نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ ایک عارضی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا تھا اور سمجھتے تھے کہ پاکستان جلد پھر سے بھارت میں آ شامل ہوگا:

> "But we accepted. We expected that partition would be temporary, that Pakistan was bound to come back to us."(24)

سردار پٹیل نے بھی اسی خوش فہمی میں برصغیر کی تقسیم کی تجویز کو قبول کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں اس حقیقت کا انکشاف درج ذیل پیرایہ بیان میں کیا ہے:

> "Among Congressmen the greatest supporter of partition was sardar Patel....He was convinced that the new State of Pakistan was not viable and could not last. He thought that the acceptance of Pakistan would teach the Muslim League a bitter lesson. Pakistan would collapse in a short time and the provinces which had seceded from India would have to face untold difficulty and hardship."(25)

روشن خیال نہرو ہوں یا تاریک اندیش پٹیل پاکستان دشمنی میں ایک سے ایک بڑھ کر جادوگر ہے۔ سوشلسٹ نہرو سے لے کر دہشت گرد ہندو نظریہ ساز سردار پٹیل تک بیشتر کانگرسی ہندو انتہا پسند کو ہ ہندوکش تک مہابھارت کے قیام کا آرزومند ہے۔ چنانچہ تلاشِ ہند (Discovery of India) کے مصنف پنڈت نہرو نے پاکستان کی تباہی کے اس خواب کو حقیقت کا روپ بخشنے کی خاطر بھارت کی کمیونسٹ پارٹی سے کام لینے کی ٹھانی۔ یوں بھارتی شہری سید سجاد ظہیر پنڈت نہرو کی درج بالا تمنا کو برلانے کی خاطر خفیہ طور پر پاکستان آئے تھے اور جب یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو واپس پنڈت جی کے قدموں میں جا بیٹھے۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اپنی متذکرہ بالا کتاب میں اس حقیقت کو بھی منکشف کیا ہے کہ زنداں سے رہائی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے اثر و رسوخ نے کام دکھایا اور یوں سید سجاد ظہیر واپس اپنے گھر الہ آباد جا پہنچے۔ یہاں

مجھے بھارت کے ترقی پسند دانشور ظ۔انصاری کا مضمون ''بنے بھائی'' یاد آنے لگا ہے۔جی چاہتا ہے کہ اس کے کم از کم دو اقتباسات قارئین کرام کی نذر کردوں:

''اب سے کوئی تیس برس پہلے ایک زمانہ تھا جب پنڈت جواہر لال نہرو زور میں تھے اور ملک کے اچھے اچھے پکھیرو چھانٹ کر اپنے آنند بھون (الہ آباد) پر جمع کر رہے تھے۔انھوں نے سروزیر حسین کے کمیونسٹ بیٹے سید سجاد ظہیر کو جو لندن سے کمیونسٹی اور بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے،اپنے دلیرانہ تبسم میں الجھا کر کانگرس کے سوشلسٹ فرنٹ میں کھینچ لیا۔ہندوستان کی غلامی اور غریبی کے درد سے بھرے ہوئے درجنوں حوصلہ مند دل اور بشاش چہرے اس صف میں کھڑے ہو گئے جن کے لیے جیل کے پھاٹک اور ہندوستان گیر شہرت کے پلیٹ فارم دونوں یکساں فیاض تھے۔ان میں سے کئی ایک کو سیاسی،سماجی یا کلچرل فرنٹ کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔اشرف،رام منوہر لوہیا،زیڈ،اے احمد اور سجاد ظہیر اسی دور میں نمایاں ہوئے۔''(۲۶)

سیدّ صاحب پنڈت جی ہی کا ایک مشن لے کر آئے تھے مگر جب پاکستان کو ختم کر کے وسیع تر بھارت میں جذب کر دینے کی سازش ناکام ہوئی اور:

''سیاسی حالات نے پلٹا کھایا تو وہ چھوٹ کر ہندوستان آ گئے۔جواہر لال سے ملنے گئے۔کوئی گھنٹہ بھر تنہائی میں باتیں ہوتی رہیں۔مہینہ بھر نہ گزرا تھا کہ جواہر لال نے انہیں بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں دھانس لیا۔کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سابق جنرل سیکرٹری،ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ممبر،راولپنڈی سازش کیس کے ملزم اور کمیونسٹ خانقاہ میں راضی برضا بسر کرنے والے بنے بھائی بھارت سیوک سماج کی آل انڈیا کونسل میں اسی اطمینان اور نیک نیتی کے ساتھ آنے جانے لگے،جیسے وہ دس برس پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسوں میں قراقلی ٹوپی زیب سر کیے ہوئے نظر آتے تھے۔''(۲۷)

سید سجاد ظہیر بلاشبہ ایک بڑی علمی،ادبی،تہذیبی وسیاسی شخصیت تھے مگر افسوس کہ بڑی شخصیات کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔عوام دوستی کا دم بھرنے والے سجاد ظہیر نے عوام کی اجتماعی رائے سے وجود میں آنے والی مملکتِ پاکستان کو رُوس اور بھارت کی کمیونسٹ پارٹیوں کے ایما پر تباہی کے راستے پر ڈالنے کی سازش کا ارتکاب صرف اس لیے کیا کہ یہ مملکتِ پاکستان عوامی اور جمہوری ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی تھی!

حواشی

۱۔ ""معنی ء آتش نفس، سجاد ظہیر"، سید سبط حسن، کراچی، ۲۰۰۵ء، صفحات ۲۴۔۳۵

۲۔ ترقی پسند ادب کے معمار، پروفیسر قمر رئیس، دہلی، ۲۰۰۶ء، صفحات ۳۴۔۳۵

3- Progressive Writers Movement and Creative Writers in Urdu, Ahmed Ali, in Carlo Coppola (ed.), Marxist Influences and South Asian Literature (East Lansing: Michigan State University Press, 1974), p.35:

"The fanfare that accompanied the first All-India Progressive Writers' Conference in 1936 was largely political and stamped with a certain ideology. It also led to its shrinking within a couple of years to a political platform, and the majority of the creative writers moved away from the official organization. The account of the Movement as written by Sajjad Zaheer two decades later in his book Rushnai, or Roshnai, contains only what he wishes to give out and eschews the real beginnings. This book is one-sided and prejudiced and blackens out even outstanding "Progressive" works."

4- A Literary Hisotry of the Progressives Writers Movement in Urdu, Oxford University Press, 2014, p.74:

"My contention, in this book, is that the PWA was the manifestation of a movement that was by no means inconsistent with the existing liberal and enlightened trends in Urdu literature; it was if anything, a logical extension of what was already being debated from social platforms and also, increasingly, being written about by Muslim writers."

5- Ibid, p.75

۶۔ فیض، شاعری اور سیاست، فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۵۔۲۶۔ مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے:
خضر ہمایوں انصاری کی کتاب: The Emergence of Socialist Thought Among North Indian Muslims-1917-1947) لاہور، ۱۹۹۰ء

۷۔ ترقی پسند ادب کے معمار، دہلی، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۴۷

۸۔ ایضاً، ۳۰

9- A Literary Hisotry of the Progressives Writers Movement in Urdu, Oxford

University Press, 2014, p. 205:

"In fact, both Mahmuduzzafar and Sajjad Zaheer had brief stints in the mid 1930s working as private secretaries to Jawaharlal Nehru....Zaheer stated that Mahmud lived in Anand Bhawan for almost two years while he worked for Nehru and he was joined by his wife, Rashid Jahan. Mahmud wrote a note on the election tour which Nehru undertook in 1937."

10- Ibid., p.202:

"The union of Soviet Writers was set up by Stalin on 23 April 1932. The Union restricted people from expressing alternate geo-political realities that differed from the policy laid down as socialist realism. This state policy was further endorsed at the Congress of Socialist Writers in 1934 and thereafter ruthlessly enforced by the Stalinist regime. Those who strayed from the official line were marginalized if not severely punished."

11- Ibid., p.217: Weekly Report, DIB, New Delhi, 30 January 1936, No. 4; IOR/L/PJ/12/430; italics mine.)

12- Ibid., p.160:

13- (IOR/L/PJ/12/499, File 70/36, January 1936-October 1941, P.217

14- Ibid., p.218

15- Ibid., Pp.216 to 217, Weekly Report, DIB, New Delhi, 30 January 1936, No.4; IOR/L/PJ/12/430:

"The same intelligence report mentions a sum of Rs. 1500 being given to Zaheer (sanctioned from Moscow, but sent through 'the usual channel') to start a magazine along with a gestetner and a typweriter in three different languages. Zaheer did, indeed, start the New Indian Literature from his father's house in Allahabad. The report mentions' a subsidy of 4 pounds a month' towards the cost of production and Zaheer's plans to visit Calcutta and Bombay in order to discuss details regarding its publication with local communists and also to get in touch with Philip Spratt with a view to securing his advice. In addition to these activities, the report mentions Zaheer's hope of organizing branches of the League against Imperialism in Bombay and Calcutta. The report concludes with a grim

prognosis for Zaheer: 'Zaheer has a growing reputation as a writer and it seems likely that, if, as I believe, his new plans are forwarded on instructions received from Moscow, the Comintern have decided to use his talents in this direction while satisfying themselves about his bonafides. If he survives the test, it is probable that he will be employed on the more important communist work for which his training in England and Germany has fitted him. Till then, it seems he will be expected to confine his activities within the limits suggested above and to the formation of the PWA."(p.217)

16- Ibid, p.236.

۱۷۔ ہماری تحریکِ آزادی اور تخلیقی عمل، مرتب احمد سلیم، لاہور، ۲۰۰۷، صفحہ ۱۸

۱۸۔ ایضاً، صفحات ۱۹۷۔۱۹۸

۱۹۔ میرے حصے کی روشنائی، نور ظہیر، لاہور، ۲۰۰۶، صفحہ ۸

۲۰۔ ایضاً، صفحات ۹۸۔۹۹

21- SURKH SALAM Communist Politics and Class Activism in Pakistan 1947-1972, KAMRAN ASDAR ALI, Oxford University Press 2015, Karachi, Pp.39, 40, 59, 81

۲۲۔ راولپنڈی سازش ۱۹۵۱، حسن ظہیر، مترجم سہیل انجم، آکسفورڈ، ۲۰۰۲، صفحہ ۲۰۰

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۱

24- The Last days of the British Raj, Leonard Mosley, London, 1961, p.148

25- India Wins Freedom, Abu-al-Kalam Azad, Orient Longmans India, 1988, p.207

۲۶۔ رسالہ گفتگو، شمارہ ۲، بمبئی

۲۷۔ ایضاً

باب دوم

سیّد سجاد ظہیر کی اقبال شناسی

سید سجاد ظہیر، محمود الظفر اور رشید جہاں ترقی پسند تنظیم کے قیام کی خاطر دو مرتبہ لاہور آئے مگر اقبال کی خدمت میں حاضر نہ ہوئے۔ پنڈت نہرو، پریم چند، ٹیگور سے رابطے کیے مگر اقبال یاد نہ آئے۔ اس تجاہل عارفانہ کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ تینوں کے تینوں پنڈت جواہر لال نہرو کے ذاتی سٹاف میں شامل تھے اور اشتراکی مادی ہمہ اُوست پر یقینِ کامل رکھنے کے باعث اقبال کی اسلامی اشتراکیت کو اپنے مشن کی کامیابی میں زبردست رُکاوٹ سمجھتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان تینوں کے تنظیمی طور پر سرگرم ہونے سے پانچ چھ برس پیشتر علامہ اقبال برصغیر میں جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک عوامی جمہوری مملکت کے قیام کا تصور باضابطہ طور پر پیش کر چکے تھے۔ ادبی وفکری طور پر وہ ترقی پسندی سے کہیں آگے بڑھ کر انقلاب کے مغنی تھے اور انقلاب بھی ایسا جو زندگی کی باطنی سطح سے اُٹھ کر زندگی کی خارجی سطح کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔ اس روحانی انقلاب کا ہمہ گیر منشور درج ذیل ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دیہہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب، اے انقلاب!
در کلیسا، ابن مریم را بدار آویختم
مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کرد با اُم الکتاب
انقلاب!
انقلاب، اے انقلاب!

ہمہ گیر انقلاب کا یہ تصور جو بیک وقت روحانی اور مادی دُنیاؤں کو منقلب کر کے رکھ دینے کا داعی تھا نہ تو انڈین نیشنل کانگرس کے لیے قابلِ قبول تھا اور نہ ہی اس سے انگلستان اور رُوس کی اشتراکی پارٹیوں کی حکمتِ عملی کی تائید ہوتی

تھی۔ نتیجہ یہ کہ بقول Carlo Coppola:

"The Progressive Movement, that loosely organized, leftist-oriented group of young writers who dominated Urdu literature during the thirties and forties, exhibited two distinct attitudes towards Muhammad Iqbal. The first of these, which was prevalent during the formative years of the movement until about 1938, was one of out-and-out contempt. The second attitude, which was characteristic of the movement when it became well established and after the poet's death, was one of deep appreciation and, in some instances, hereo-worship."(1)

اول اول حقارت اور بعد ازاں پرستش۔ کارلو کپولا نے اقبال کے حضور ترقی پسند قیادت کی قلابازی کی بالکل درست نشاندہی کی ہے۔ سجاد ظہیر نے اقبال کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:

ہمارے ساتھ علامہ اقبال کے التفات وعنایت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرأت ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلاف اور شکائتیں تھیں وہی ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ کروں۔ سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہوگئی اور شاید میں نے ان سے کہا ہماری نظر میں قوم کی غلامی، بین الاقوامی جنگ، محنت کشوں کے ظالمانہ استحصال کا علاج موجودہ دور میں اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن انھوں نے بعض مقامات پر اپنے کلام میں اشتراکی نظریہ پر غلط نکتہ چینی کی ہے۔ خود ان کی آزادی خواہی اور انسان نوازی کی منطق، ہمیں سوشلزم کی طرف لے جاتی ہے۔ اور ہماری نظر میں نوع انسانی کی موجودہ ارتقا کی منزل وہی ہے۔ میں نے کہا کہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اس نئے نظریے سے کافی متاثر ہے۔ وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے۔ بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لیے میری ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔(۲)

آج سے تیس بتیس برس پیشتر میں نے اپنے مضمون بعنوان ''اقبال ... مجموعہ اضداد یا دانائے راز؟'' میں ممتاز ترین ترقی پسند ناقدین... مجنوں گورکھپوری (اقبال)، اختر حسین رائے پوری (ادب اور انقلاب)، علی سردار جعفری (ترقی

پسند ادب) اور ممتاز حسین (نقدِ حیات)..... کی جانب سے اقبال کو فرقہ پرست سے لے کر سستے قسم کی ملتیت اور فاشزم کا ترجمان ہونے کے الزامات کا جائزہ لیتے وقت انھی نقادوں کی جانب سے بعدازاں اقبال کی اِن الزامات سے بریّت کا ایک مطالعہ پیش کیا تھا۔ بعدازاں جب پروفیسر سخاچوف کے سے رُوسی دانشوروں نے اقبال کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا تو اُردو کے متذکرہ بالا نقادوں نے بھی اپنی قلب ماہیت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ [۳] چنانچہ نامور ترقی پسند نظریہ ساز علی سردار جعفری نے سید سجاد ظہیر کی یاد میں ''رقصِ شرر'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں اِس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اُن میں:

> ''اور بنّے بھائی میں اقبال شناسی پر ہمیشہ دوستانہ جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ اقبال کی شاعری نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے فیض اور مخدوم جیسے انقلابیوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ ان میں مسلم قدامت پرستی کی ایک رو تھی۔ وہ پہلے اُردو شاعر تھے جنھوں نے ۱۹۱۹ء میں روسی انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا۔ ابتدا میں بنّے بھائی اس تضاد کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے جو لینن نے ٹالسٹائی میں اور گورکی نے پشکن میں دیکھا تھا لیکن یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعد کو انھوں نے اقبال کے بارے میں اپنی رائے بدل دی۔ بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات اس سال مارچ کے آخر یا اپریل کے شروع میں ہوئی تھی۔ جب انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں اقبال سیمینار کا افتتاح کیا اور میں نے اقبال پر ایک مقالہ پڑھا۔ یہ سیمینار اقبال کے صد سالہ جشن کی تیاری کے سلسلے میں ہوا تھا۔'' [۴]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علی سردار جعفری نے فیض اور مخدوم کی جن زبان زدِ عام نظموں کا ذکر کیا ہے اُن سے اپنے دل و دماغ کو ایک مرتبہ پھر منور کر لیں۔ فیض کی نظم کے آخری دو بند درج ذیل ہیں:

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز

یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے خبر

اور اب مخدوم محی الدین کی نظم بعنوان "اقبال":

اس اندھیرے میں یہ کون آتشِ نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا
موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں، چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں بٹنے لگیں، چھٹنے لگیں
اک شرارہ اُڑتے اُڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا
عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے
پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہُوا پایا گیا
وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ، در بدر، گاتا گیا
گیت سننے کے لیے خلقِ خُدا، آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی
نغمۂ جبرئیل ہے اِنسان کا گانا نہیں
صُورِ اسرافیل ہے دُنیا نے پہچانا نہیں
عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

اقبال کی رحلت پر بھی مخدوم نے ایک مختصر نظم کہی تھی:

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا
کس کی نظر نے اُس کو نظربند کر دیا؟
اُس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا؟
شُعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
اُمّت کا شب چراغ اندھیرے میں کھو گیا

خود سید سجاد ظہیر نے اقبال کی وفات سے دس بارہ برس بعد سازش کی ناکامی کے نتیجے میں اپنی اسیری کے دوران اقبال کی یاد میں لکھتے ہوئے اعتراف کیا کہ:

''اقبال سے پہلی بار ملاقات کا تجربہ میرے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان کا کلام بچپن سے ہمارے ذہن اور روح بلکہ خون میں رچا ہوا تھا۔ چھوٹی عمر میں جب ہماری زبان میں لکنت تھی ہم کو ان کے قومی اور ملی ترانے یاد کرائے گئے تھے۔ جوں جوں عمر بڑھی اور شعور آیا مسدس حالی کے ساتھ ساتھ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر کے بیشتر حصے ورد زبان رہتے تھے۔ بانگِ درا شائع ہوئی تو اس کی ''تلاوت'' ادبی اور قومی سمجھ کر ہوتی رہی۔ انگلستان کی تعلیم کے زمانے میں اقبال کا فارسی کلام پڑھتے رہے۔ میں خود جب اپنی ذہنی اور ادبی تربیت کے متعلق اپنے طالب علمی کے زمانے کا خیال کرتا ہوں تو اُردو کے شاعروں میں انیس، غالب، حالی اور اقبال کا اس میں سب سے زیادہ حصہ نظر آتا ہے........ میں نے تہیہ کیا کہ اگلی بار جب پنجاب آؤں گا تو ان سے پھر مل کر تحریک کے متعلق زیادہ وضاحت سے گفتگو کروں گا لیکن بدقسمتی سے اس کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دوبارہ لاہور گیا تو وہ طائر قدسی اس جہان سے پرواز کر چکا تھا۔''(۵)

کمیونزم کے خوب و ناخوب، رسائی اور نارسائی کے باب میں، تمام تر اختلاف کے باوجود علامہ اقبال کو ''طائر قدسی'' قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں علامہ اقبال کے ساتھ اپنی پہلی اور آخری ملاقات کی روداد بیان کرتے وقت اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال اختلافِ رائے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے خوگر تھے۔ جہاں تک نوجوانوں کی اختلافی رائے کو انتہائی شفقت اور بڑی خندہ پیشانی سے سُننے کا تعلق ہے وہ ''ادب اور انقلاب'' کے مصنف اختر حسین رائے پوری ہوں یا ''روشنائی'' کے سیّد سجاد ظہیر، اقبال ہمہ تن گوش مگر خاموش رہتے تھے۔ اِس باب میں بحث کی قطعاً کوئی گنجائش اس لیے بھی نہیں تھی کہ اقبال نے سوویت یونین کی اشتراکیت کا تو خیر مقدم کیا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ دہریت کو اشتراکیت کی آخری منزل نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھیں اُمید تھی کہ اشتراکی رُوس کی دہریت اس

اور یوں وہ اپنا ارتقائی سفر جاری رکھتے ہوئے نفی حقیقت کو سمجھ پائے گی کہ: ع: "لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللہ کا" اور یوں وہ اپنا ارتقائی سفر جاری رکھے گی۔ لینن اور سٹالن اس حقیقت کو نہ سمجھ پائے اور یوں روسی اشتراکیت نفی سے اثبات کی جانب (بگذر از لا، جانب اِلّا خرام) اپنا سفر جاری رکھنے کے بجائے نفی پر ہی منجمد ہو کر رہ گئی۔ انجماد، زوال اور موت کی علامت ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں اپنے عظیم شاہکار "جاوید نامہ" میں ظاہر کر دیا تھا۔ اپنی نظم بعنوان "اشتراکیت" میں انھوں نے رُوس میں اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کرتے وقت اس انقلابی آرزومندی کا اظہار کیا تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب حقیقی اسلام کی انقلابی رُوح بروئے کار آئے:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سُود نہیں رُوس کی یہ گرمیِ رفتار
اندیشہ ہُوا شوخیِ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہُوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کُھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرف 'قُلِ العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

ہر چند اقبال نے "کارل مارکس کی آواز" کی سی نظموں میں اشتراکیت کا بھرپور اور پُرجوش خیر مقدم کر رکھا ہے تاہم وہ رُوس کے اشتراکی انقلاب کے بعد ہمیشہ آرزومند رہے کہ دُنیا میں سچی قرآنی تعلیمات کی انقلابی روح کے مطابق اسلامی اشتراکیت کا بول بالا ہو۔ عزیز احمد نے اقبال کے اس تصور کو "روحانی اشتراکیت" سے تعبیر کیا ہے۔(۶) برسوں پہلے سن ۱۹۳۲ء میں، جب سید سجاد ظہیر لندن میں اشتراکیت کی ابجد سیکھنے میں مصروف تھے اقبال نے "جاوید نامہ" میں "اشتراکیت و ملوکیت" ہر دو کو "یزداں ناشناس، آدم فریب" قرار دے دیا تھا۔ انھوں نے اشتراکی نظام کے خوب و ناخوب پر اظہار خیال کرتے وقت کارل مارکس کو "پیغمبر بے جبرئیل" اور اُس کے دماغ کو کافر گر دل کو مومن قرار دیا تھا:

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ اُو در دل نہ در آب و گل است

اسی طرح ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں اسی موضوع کو کلمہ طیبہ کی انقلابی تفسیر کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

ہمچنان بینی کہ در دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خون
از ضمیرش حرف لا آمد برون
آن نظام کہنہ را برہم زد است
تیز نیشِ بر رگ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا الہ
فکر او در تند باد لا بماند
مرکب خود را سوی اِلّا نراند
آیدش روزی کہ از زور جنون
خویش را ازین تند باد آرد برون
در مقام لا نیا ساید حیات
سوی اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگ اُمتان
نفی بے اثبات، مرگ اُمتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل
تا نگردد لا سوی اِلّا دلیل

اقبال کا یہ اندیشہ کہ ''نفی بے اثبات، مرگ اُمتاں'' سچ ثابت ہوا اور رُوس کے اشتراکی نظام کی ''نفی بے اثبات'' بالآخر موت سے ہمکنار ہو کر رہ گئی۔ اقبال کا اسلامی اشتراکیت کا تصور بے خدا اشتراکیت (دہریتِ رُوس) کے قبولِ عام کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کا جغرافیائی وجود بھی اقبال کی انقلابی اسلامی فکر

سے ہی چھوٹا ہے۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر انجمن ترقی پسند مصنفین کے کمیونسٹ نظریہ ساز، ایک زمانے میں، ردِ اقبالیات کی مہم کے قافلہ سالار بن کر رہ گئے تھے۔ اس ضمن میں قیامِ پاکستان کے بعد کی صورتِ حال پر فیض احمد فیض کا یہ اعتراف سند کی حیثیت رکھتا ہے:

> ''۱۹۴۹ء میں حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو Demolish کریں۔..... پھر ایک روز مظہر علی خان کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صفدر میر صدر تھے۔ قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو سکہ بند قسم کی بے معانی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف پاکستان ٹائمز چلاتے رہے۔''(۷)

جاننا چاہیے کہ اقبال کے انہدام کی تمنا فی الحقیقت پاکستان کے انہدام کی آرزو ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب روپوش اشتراکی طالع آزماؤں نے انہدام کے یہ احکامات جاری کیے تھے اُس وقت پنڈت نہرو پاکستان کے بھارت میں جذب ہو جانے کی تمنا کو سرسبز و شاداب بنانے میں کوشاں تھے۔ چنانچہ صرف لاہور ہی نہیں پاکستان کے ہر بڑے شہر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار ادبی مجالس میں اقبال کے خلاف بے بنیاد الزامات پر مبنی مضامین پڑھنے کی ایک مہم شروع کر دی گئی تھی۔ بعدازاں جب رُوس کے اشتراکی دانشوروں نے اقبال کی شاعری کی انقلابی لے کی تحسین شروع کر دی تھی تب اُن کے اُردو مقلدین بھی اپنے منفی خیالات سے رجوع کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

یہاں مجھے سید جمال الدین نقوی کی خودنوشت Leaving the Left Behind یاد آئی ہے۔ پروفیسر سید جمال نقوی کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے انتہائی ایثار پیشہ رہنما ہیں۔ اُنھوں نے اپنی جوانی قید و بند میں گزاری ہے۔ زندان و سلاسل کے کڑے سے کڑے مراحل اُن کی نظریاتی استقامت پر کبھی بھی منفی طور پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ہر چند پاکستان میں گرفت و احتساب کے اداروں کا شدید ترین ظلم بھی اُن کی نظریاتی اصابت میں ذرا سی کمزوری بھی نہ لا سکا تاہم جب وہ سوویت یونین تشریف لے گئے تب وہاں کے تجربات و مشاہدات نے اُن کے دل و دماغ میں ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ کتاب کے ابتدائیہ میں وہ نظریہ و عمل کے روح فرسا تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مُلّائیت (Dogmaticism) کے خلاف اُن کی عمر بھر کی جدوجہد کا حاصل ایک نئی طرح کی مُلّائیت نکلا۔(۸) کتاب کے آخری باب میں نقوی صاحب نے اشتراکی رُوس میں اپنے مشاہدات کی بنا پر انتہائی چشم کشا انکشافات کیے ہیں جن کے تناظر میں یہ کتاب ایک بے لوث، ایثار پیشہ اور پُرعزم و استقلال شخصیت کی زندگی کی رائیگانی کا نوحہ بن کر رہ گئی ہے۔(۹) معروف ترقی پسند دانشور مسلم شمیم نے اپنی کتاب بعنوان ''نظریات کا تصادم'' میں اس حقیقت

کا اعتراف کیا ہے کہ: ''انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں بھی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا کلیدی کردار تھا۔'' مسلم شمیم نے اپنی اسی کتاب کے ایک طویل باب ''سوویت یونین کا المیہ'' میں اپنے دورہ روس کی روداد میں کمیونسٹ آمریت کے چند بھیانک اور ہولناک تجربات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ سوویت دانشوروں سے اپنے مکالمات و مذاکرات کی روشنی میں مارکسزم کی عملی تعبیر کے مایوس کن نتائج کی عکاسی کی ہے۔[۷] ان کی اس روداد سفر کو پڑھ کر اقبال کا مصرعہ: 'طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی' بے ساختہ یاد آ جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ سید جمال الدین نقوی اور مسلم شمیم اپنے پہلے دورہ روس میں ہی جن بدنما حقائق کی تہہ تک پہنچ گئے سید سجاد ظہیر وہاں بار بار آتے جاتے رہنے کے باوجود نہ جان سکے یا شاید نہ بیان کر سکے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال لاہور میں بیٹھے بیٹھے، ہی روس کے اشتراکی انقلاب کا پُر جوش خیر مقدم کرنے کے باوجود پیش از وقت ہی اس انقلاب کو درپیش رد انقلاب کے خطرات کی نشاندہی فرما گئے تھے۔ سچ کہتے تھے سید سجاد ظہیر، اقبال واقعتاً ایک ''طائر سدرہ'' تھے!

حواشی

1- Journal of South Asian and Middle Eastern Studies, Iqbal Centennial Issue, Vol. 1, No.2, December 77, p.49

۲- روشنائی، سجاد ظہیر، کراچی، ۱۹۷۶ء، صفحات: ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹:

۳- اقبال فکر و عمل، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۵ئڈ

۴- رسالہ ''گفتگو'' ترقی پسند ادب نمبر، مدیر اعلیٰ: علی سردار جعفری، بمبئی، دسمبر ۱۹۷۹ء، ;

۵- روشنائی، سجاد ظہیر، کراچی، ۱۹۷۶ء، صفحات: ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۹:

سجاد ظہیر نے اپنے اشتراکی جریدہ ''قومی جنگ'' (بابت ۲۲۔اپریل ۱۹۴۵ء) میں ''اقبال کا پیغام حیات'' کے عنوان سے اقبال کو بھرپور خراج تحسین پیش کیا تھا۔

۶- ترقی پسند ادب، عزیز احمد، دہلی، ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱۰۰

۷- ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ڈاکٹر ایوب مرزا، لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۳۷۔۱۳۸

8- Leaving the Left Behind, Sed Jamaluddin Naqvi with Humair Ishtiaq, Karchi, 2014, p.011: "During my time in prison, the Communist Party of Pakistan had also moved on -- nudged along by some state and non-state actors -- and I was no more part of its core leadership. I was more of an elder statesman than a politician. This allowed me the liberty to take a detached view of what my life had been, and

no have a rational view of what I had seen in what used to be the Soviet Union. At the end of the process, two things were crystal clear to me: one, that in fighting against dogma, I had been gripped by dogma of another kind; and, two, mine was a life wasted."

9. Ibid, Pp. 178-179: "The Communist Parties were nothing but autocratic oligarchies that gave no space for open discussion or debate. In my interaction with Communists from various countries, I found the French and Italian Communist Parties to be much better in their levels of intellect and behavior than that of, say, India which was bad, while the worst, without a doubt, was the Soviet, which considered itself the mother of all Communist Parties. The difference, to my eyes, was because of the generally improved social conditions prevalent in Europe under democratic dispensations that in other areas of the world.....We always condemned our governments for denying freedom of expression without realizing that in our Communist backyard, such a freedom was non-existent. We were much better off compared to our friends in the Communist world."

۱۰۔ نظریات کا تصادم، مسلم شمیم، کراچی، ۲۰۱۰ء، صفحات ۲۳۷ تا ۲۴۲

باب سوم

پابندیٔ اظہار کی بدترین مثال

انجمن ترقی پسند مصنفین بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مختلف الخیال حریت پسند ادیبوں کے متحدہ محاذ کی صورت میں وجود میں آئی تھی۔ اس میں جہاں پنڈت نہرو کے آنند بھون میں عرصۂ دراز تک مقیم رہ کر اُن کے پرسنل سٹاف میں کام کرنے والے میاں بیوی محمود الظفر اور رشید جہاں سرگرم عمل تھے وہاں مولانا حسرت موہانی کا سا صوفی مومن بھی فعال تھا۔ مختلف تصورات اور خیالات کے حامل یہ سب افراد سیاسی آزادی، معاشی انصاف اور معاشرتی اخوت و مساوات کے اصولوں پر متحد ہوئے تھے مگر ایک دو سال کے اندر اندر اس پر کمیونسٹ نظریہ سازوں کی آمریت مسلط ہو کر رہ گئی تھی۔ تخلیق کار اپنی دُھن میں تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے مگر یہ غیر تخلیقی اشتراکی نظریہ ساز ان کی جا و بے جا گرفت میں مصروف رہتے تھے۔ سچے جذبات کے والہانہ اظہار پر یہ پابندی اور حریت فکر و عمل پر یہ قدغن جوزف سٹالن کی متشددانہ حکمتِ عملی اور سوویت رائٹرز یونین کی کورانہ تقلید پر مبنی تھی۔ اس نظریاتی اور تخلیقی احتساب کی بدترین مثال پاکستان کا قومی و ملی ترانہ ہے۔

سٹالن نے سوویت رائٹرز یونین ۲۳ اپریل ۳۲ء کو قائم کی تھی۔ اس یونین نے ادیبوں اور شاعروں پر غیر سرکاری صداقت کے اظہار پر پابندی عائد کر دی تھی۔ سوویت حقیقت نگاری کی تعریف متعین کر دی گئی تھی۔ اس کی رُو سے صرف اُن ہی خوشگوار حقائق کو پیش کیا جا سکتا تھا جو سٹالن کے دورِ حکومت میں سوویت ''فتوحات'' کی عکاسی کرتے ہوں۔ یہ ریاستی پالیسی ۱۹۳۴ء میں انتہائی آمرانہ اور بڑے سفاکانہ انداز میں روبہ عمل آنے لگی تھی۔ جو ادیب، شاعر اور نقاد اس حکمتِ عملی کو قبول کرنے سے احتراز کے خُوگر تھے اُنھیں ادبی دُنیا سے غائب کر دینے یا دُور رکھنے کی مساعی عمل میں آنے لگی تھیں۔(۱) ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھیمڑی کانفرنس میں اسی پالیسی کو اپنا کر چند انتہائی خلاق ادیبوں کو ترقی پسند تنظیم کی صفوں سے الگ کر دینے کی کوشش کی گئی مگر مولانا حسرت موہانی کی حریتِ فکر اور جرأتِ اظہار نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ سجاد ظہیر کی روپوش قیادت میں پاکستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں چونکہ کوئی حسرت موہانی موجود نہیں تھے اس لیے سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری اور ممتاز شیریں کے سے خلاق ادیبوں کا بڑی آسانی کے ساتھ بقول منٹو حقہ پانی بند کر

دیا گیا تھا۔

ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین میں پنڈت نہرو کے اثر و رسوخ اور کمیونسٹ پارٹی کے تسلط کی نمایاں ترین مثال پاکستان کا وہ قومی و ملی ترانہ ہے جسے مخدوم محی الدین اپنے منسوخ کلام میں شامل کرنے پر مجبور کر دیے گئے تھے۔ (۲) یہ پاکستان کا وہ قومی و ملی ترانہ ہے جس کی گونج سن چالیس کی دہائی میں پورے برصغیر میں یہاں وہاں سُنائی دینے لگی تھی۔ اس کی تخلیق مخدوم محی الدین اور اسرار الحق مجاز کا مشترکہ کارنامہ بتایا جاتا ہے۔ یہ ترانہ مجاز کے مجموعۂ کلام ''شب تاب'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل کے نزدیک:

''مجاز کے اس مجموعۂ کلام کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مجاز نے اس کا انتساب ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو لکھا تھا۔ ۲۳ مارچ کے بجائے اُنھوں نے 'یومِ پاکستان' لکھنا پسند کیا۔ عبارت کی ترتیب یوں ہے:

عصمت کے نام

مجاز

یومِ پاکستان۔ دلی مارچ ۱۹۴۵ء......'' (۳)

شفقت رضوی اپنی کتاب بعنوان ''مخدوم محی الدین: حیات اور ادبی خدمات'' میں لکھتے ہیں کہ ''یہ ترانہ پاکستان مخدوم اور مجاز کی مشترکہ شعری کاوش ہے۔ نظر حیدرآبادی اسے مخدوم کی تخلیق بتلاتے ہیں۔ مخدوم سے ذاتی واقفیت اور جس مشاعرے میں مخدوم نے اسے سُنایا تھا اُس میں موجودگی کی بنا پر اُن کے بیان کو مصدقہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ نظر نے لکھا ہے: مخدوم نے ''ترانہ پاکستان'' بھی لکھا تھا جسے مجاز نے اپنی دماغی علالت کے زمانہ میں تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد کمیونسٹ پارٹی کے مشہور اخبار ''نیا زمانہ'' بمبئی نے حقیقتِ حال کا انکشاف کر دیا تھا۔ (۴) صحیح صورتِ حال کا انکشاف مرزا ظفر الحسن نے کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جب کُل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدرآباد دکن میں منعقد ہوئی ظفر الحسن دکن ریڈیو سے وابستہ تھے۔ اس موقع پر دکن ریڈیو نے کُل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ وہ اس کے منتظمین میں شامل تھے اور مشاعرے میں موجود تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مخدوم نے اسی میں اپنی نظم 'پاکستان ہمارا' نشر کی۔ (۵) انہی مرزا ظفر الحسن نے اپنی ایک اور کتاب میں مزید وضاحت کی ہے کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کرشن چندر نے مجھ سے کہا حیدرآباد ریڈیو بڑا ترقی پسند سٹیشن ہے۔ اگر تم یہ نظم آل انڈیا ریڈیو سے نشر کرواتے تو انگریز تمھیں اور تمھارے پورے خاندان کو سولی پر لٹکا دیتے۔'' (۶) کامریڈ کے ایل مہندرا کمیونسٹ پارٹی میں مخدوم کے دیرینہ رفیقِ کار تھے۔ اُنھوں نے مخدوم محی الدین پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''پارٹی نے پاکستان کی تحریک کی حمایت شروع کر دی تھی لیکن بعد میں نظرِ ثانی کے بعد

حمایت ترک کر دی۔ انھوں نے (مخدوم نے) وہ نظم لکھی جس میں "پاکستان ہمارا" کے نعرہ کو ایک عوامی نعرہ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تھا۔ مخدوم کو پارٹی کے فیصلوں میں نظر ثانی کے بعد اس نظم کے مضمرات پر بھی غور کرنا پڑا اور انھوں نے اپنے کلام سے خارج کر دیا مگر عرصہ تک یہ نظم محفلوں اور مجلسوں میں دادِ تحسین حاصل کرتی رہی۔" (۷)

شفقت رضوی صاحب نے اپنی اسی کتاب میں صورتِ حال پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ: "ترانہء پاکستان عرصہ تک کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مزدوروں کے جلسوں میں بھی پڑھا جاتا رہا۔ ممکن ہے مجاز نے اس میں لفظی ردو بدل بھی کیا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مخدوم کی شعری کاوش ہے اور وہ ایسے ترقی پسند شاعر تھے جو قیامِ پاکستان کے حامی تھے۔"(۸) اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو شاعروں کی مشترکہ تخلیق "پاکستان کا ملی ترانہ" کا مکمل متن زیرِ غور لائیں:

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گرزوں پر چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
سرمائے کا سوکھا جنگل اُس میں سرخ شرارا

پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

سو انجیلوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا
ہر تُرک اپنا، ہر حُر اپنا، ہر افغان ہمارا
ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر اِنسان ہمارا
ہم سب پاکستان کے غازی پاکستان ہمارا

پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا
پاکستان ہمارا

اس بحث سے قطع نظر کہ درج بالا روح پرور ترانے کی تخلیق میں مجاز کا کتنا حصہ ہے اور مخدوم کا کتنا؟ اس حقیقت سے آنکھیں چار کرنا ضروری ہے کہ دہلی سے لے کے دکن تک ترقی پسند شاعروں کے دل و دماغ میں تحریک پاکستان کے خواب و خیال ہر آن مچل رہے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پر مسلط کمیونسٹ آمریت سے سرتابی کی مجال نہ رکھتے ہوئے بھی شاعر اور ادیب، کسان اور مزدور طلوع پاکستان کے انتظار میں نغمہ سنج تھے۔ کاش انجمن کی قیادت نہ پنڈت جواہر لال نہرو کے آنند بھون کے جادو میں اسیر ہوتی اور نہ ہی رُوس کی کمیونسٹ پارٹی کی تنخواہ دار!(۹)

◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆

حواشی

1- A Literary History of the Progressive Writers Movement in India, Rakhshanda Jalil, Oxford, 2014, p.202:

۲۔ مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے، ڈاکٹر شاذ تمکنت، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳

۳۔ تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ، معین الدین عقیل، کراچی، ۱۹۷۶ء، صفحہ ۵۲۶

۴۔ اقبال اور حیدرآباد، نظر حیدرآبادی، کراچی، سن ندارد، صفحہ ۱۳

۵۔ عمر گذشتہ کی کتاب، مرزا ظفر الحسن، کراچی، ۱۹۷۸ء، صفحہ ۱۰۷

۶۔ ذکر یار چلے، مرزا ظفر الحسن، کراچی، سن ندارد، صفحہ ۳۹۳

۷۔ کامریڈ مخدوم، رسالہ نیا ادب، مخدوم نمبر، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۷۰ء، صفحات ۷۷-۷۸

۸۔ مخدوم محی الدین: حیات اور ادبی خدمات، شفقت رضوی، کراچی، سن ندارد، صفحہ ۱۰۸

۹۔ ڈاکٹر رخشندہ جلیل نے اپنی کتاب بعنوان A Literary History of the Progressive Writers Movement in Urdu میں برطانوی ہند اور برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں کی تفصیلی رپورٹس کی بنا پر لکھا ہے کہ:

"However, his avowed plans of setting up the AIPWA, based as they were on the assumption of financial and moral support from abroad, seem to bear upon them the stamp of authority higher than his own. he had not left England when B.F. Bradley returned from the Seventh World Congress in Moscow and possibly this, or a clandestine discussion somewhere in Europe provided the explanation." (Oxford, page 216)

رخشندہ جلیل نے ان ایجنسیوں کی تفصیلی رپورٹس کے تجزیاتی مطالعے سے درج ذیل حتمی نتائج اخذ کیے ہیں:

"Two things may be concluded from the intelligence reports (cited in such detail above because one seldom gets to see them in real perspective). One, they stress a link between Sajjad Zaheer and Moscow, if not directly than definitely through

the CPGB which played the role of a via media for Indian communists; and two, Sajjad Zaheer, once set on the trajectory he had sketched for himself with some inspiration from Moscow and the rest from London, executed his 'part' brilliantly to the last detail." (Ibid., Oxford, page 217)

یہاں اس حقیقت کا انکشاف ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادبی تحریک پر متذکرہ بالا کتاب میں شامل ایک تفصیلی رپورٹ میں سید سجاد ظہیر اور رُوس کی کمیونسٹ پارٹی کے مابین گہرے تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے سجاد ظہیر کو روس کی جانب سے Employed قرار دیا گیا ہے۔

باب چہارم

احمد ندیم قاسمی

تحریکِ خلافت سے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان تک

تحریکِ آزادی کے زمانے میں مسلمان ادیب اور مسلمان قوم کی روز بروز بڑھتی ہوئی بیگانگی کا خیال افروز تجزیہ کرتے وقت محمد حسن عسکری نے اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ "خلافت جیسی تحریک کو اردو افسانے میں نمائندگی نہیں ملی۔"[1] احمد ندیم قاسمی اس عمومی صداقت سے استثنٰی کی ایک روشن مثال ہیں۔ انھوں نے تصورِ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ عوامی جمہوری جدوجہد جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا تھا اس کی کوئی ایک جھلک بھی کسی اور افسانہ نگار کے ہاں نظر نہیں آتی مگر ندیم کے ہاں اپنے تمام تر جلال و جمال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے "سرخ ٹوپی" اور "ارتقا" کے نام سے تحریکِ خلافت اور تحریکِ پاکستان پر دو یادگار افسانے لکھے ہیں اور پاکستان کے تصور اور پاکستان کے طلوع کو اپنے ایک ناولٹ "پت جھڑ" کا موضوع بنایا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے اور صرف پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے تحریکِ خلافت کے مقبول ترین رہنما محمد علی جوہر کا مرثیہ لکھا۔ گویا تحریکِ خلافت کی ہنگامہ خیزیاں اُن کے لڑکپن کی ناقابلِ فراموش یادوں کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ اس کو یاد کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ:

> "قومی جدوجہد میں ماہیا اور ڈھولا نے دیہاتی قومی کارکنوں کو بہت سہارا دیا۔ فرنگی کی مخالفت، پاکستان کی حمایت اور عوام کی رُوحوں کی پکار کو ان کے اندر جذب کر لیا گیا...... تحریک خلافت کے دنوں میں علی برادران کے پیروؤں نے ٹپے سے پروپیگنڈہ کا کام نہایت دُوراندیشی اور مہارت سے لیا۔ ایک ٹپے کا ابتدائی بند یہ ہے:
>
> انور موڑ مہار وے
> سانوں تیریاں لوڑاں
> تیرے ہوندیاں یار وے
> سانوں لُٹ لیا چوراں"[2]

ہر چند تحریکِ خلافت ندیم کے شعور مند ہونے سے پہلے ہی سیاسی ناکامی سے دوچار ہو کر تنظیمی اعتبار سے منتشر ہو چکی تھی مگر آزادی و مساوات اور بغاوت و انقلاب کے ساز پر چھیڑے گئے نغمات اور حریت کی لے پر گائے جانے والے عوامی گیت برصغیر کے گوشے گوشے میں زبان زد عام تھے۔ سامراج دشمنی اور انقلاب دوستی کے یہ ترانے ندیم کے شخصی مزاج اور فنی مسلک ہر دو کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجابی لوک گیت کا درج بالا ٹکڑا جو ندیم کے کانوں میں ابھی تک گونج رہا ہے اس زمانے کی یادگار معلوم ہوتا ہے جب تُرک مجاہد انور پاشا (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۲۲ء) دُنیا بھر کے محکوم و مظلوم مسلمانوں کے لیے شجاعت و مردانگی اور آزادی و خود مختاری کی آتشیں علامت بن چکا تھا۔ اتحادِ اسلامی کا یہ سربکف علمبردار اپنی زندگی کے آخری دو برسوں میں وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کو روسی استعمار سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں سرگرم عمل رہا اور بالآخر بخارا میں سوویت فوج کے ہاتھوں شہید ہوا۔ ''انور رموز مہاروے'' میں انور پاشا کو فرنگی استبداد کے خلاف ہندی مسلمانوں کی تحریکِ مزاحمت کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مصطفیٰ کمال اتاترک کے بجائے انور پاشا ہندی مسلمانوں کی اجتماعی آرزوؤں کی بھرپور علامت بنے ہوئے تھے۔ ہندی مسلمان بھی انور پاشا کی مانند اپنے اجتماعی مقدر کو پوری دنیائے اسلام کے مقدر سے وابستہ سمجھتے تھے اور وسیع تر اسلامی برادری کو مصائب سے نجات دلانے کی جدوجہد میں اپنے قومی مصائب کو فراموش کر چکے تھے۔ اتحادِ اسلامی کی اس تحریک کو سامراج نے کچل کر رکھ دیا تھا۔ بقول اقبال:

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''سُرخ ٹوپی'' اسی کلاہِ لالہ رنگ کی رسوائی کے احوال و مقامات کا تذکرہ ہے۔ پنجاب کے ایک دُور افتادہ اور پسماندہ گاؤں کی:

> ''کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے سُرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکی رہتی تھی جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند تارے کا نشان بھی تھا۔ ایک روز مہری نے گاموں سے پوچھ ہی لیا کہ ''ٹوپی کس کی ہے؟ کون پہنتا ہے؟ یہاں کیوں لٹک رہی ہے؟'' اور گاموں نے جواب دیا ''یہ ایک بہت اچھے زمانے کی یاد دلاتی ہے مجھے۔ کچھ سال گزرے ہمارے ملک پر ایک بہت اچھا زمانہ آیا تھا۔ میں اُن دنوں بچہ ہی تھا لیکن ابا مجھے بتایا کرتے تھے کہ اُس زمانے کو خلافت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ابا قصبے سے گتا خرید کر لائے اور اُس پر سُرخ کھدر چڑھا کر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند تارا ٹانک کر یہ ٹوپی بنائی اور میرے سر پر رکھ دی۔ بزرگ لمبے لمبے جھنڈے کاندھوں پر رکھے گلیوں کے چکر کاٹتے اور ہاتھ، ہاتھوں میں ڈال کر ہم بچے اُن کے پیچھے پیچھے چلتے اور گایا کرتے:

انت الهادی انت الحق

لیس الهادی اِلّا هو . . . . ‘‘

پھر یہ ہوا کہ:

’’ابا کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور چھ مہینے وہ جیل میں چکی پیستے رہے۔ واپس آئے تو بیمار تھے۔ چار پائی سے لگ گئے۔ آخر چل بسے۔ نمبردار جی کی دشمنی نہ ہوتی تو انھیں کون قید کرتا۔ وہ تو بس انت الهادی انت الحق زور زور سے گایا کرتے تھے۔ سرکار کے خلاف تو انھوں نے کبھی کچھ کہا نہیں۔ یہ سُرخ ٹوپی اُن دنوں کی نشانی ہے۔ پڑی رہے کبھی کام آئے گی۔‘‘

انگریز استعمار نے کلاہِ لالہ رنگ کو پورے زمانے میں رسوا کر دیا مگر گاموں نے اسی سُرخ ٹوپی کو ایک سہانے زمانے کی یادگار جان کر سنبھال رکھا ہے۔ یہ یاد اُس کا سامراج دشمن ماضی ہے جسے وہ اپنے بیٹے کا مستقبل بنانے کا آرزومند ہے۔ المیہ یہ ہے کہ گاؤں میں سامراج کا عیار کارندہ..... نمبردار گاموں کے اس عزم سے واقف ہے۔ چنانچہ:

’’وہ بولا، میں پکا ہونے والا تھا۔ اس لیے میرے افسروں نے چال چلن کے بارے میں نمبردار سے پوچھ بھیجا تھا۔ نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔ اُس کا والد ’’انت الهادی انت الحق‘‘ پڑھا کرتا تھا اور اُس کے گھر میں ابھی تک سُرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے جس پر چاندتارے کا نشان ہے..... افسروں نے مجھے برخاست کر دیا ہے۔‘‘

تحریکِ خلافت ندیم کے ہاں اُس مقدس آگ کی صورت میں جلوہ گر ہے جو کبھی بجھائی نہ جا سکی۔ انگریز کے سیاسی و معاشی استبداد نے جب گلی، بازار اور کھیت کھلیان میں اس آگ کو ٹھنڈا کر دیا تو یہ جانبازوں کے دلوں میں دہکنے لگی۔ افسانہ ’’ارتقا‘‘ میں یہ آگ نسل در نسل منتقل ہوتی نظر آتی ہے اور اس کے زیرِ اثر تحریکِ خلافت تحریکِ پاکستان بنتی دکھائی دیتی ہے:

’’تحریکِ خلافت کے دنوں میں اچانک بوڑھے کے دل میں اپنے بیٹوں کی یاد ایک عجیب زہریلی صورت اختیار کر گئی۔ گاؤں بھر میں بلند ترین جھنڈا اُس کا تھا، بلند ترین نعرہ اُس کا تھا، بلند ترین دعویٰ اُس کا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود اُس نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور دہقانوں کا محبوب ترین نمائندہ بن گیا۔ ایک مرتبہ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ تم آنسوؤں کی اجازت نہیں دیتے تھے، اب دل کا غبار نکالنے کے لیے تمہارے سامنے تمھاری اجازت کے بغیر یہ آنکھیں شرارے اگلیں گی اور یہ شرارے تمھارے خس و خاشاک پر گریں گے اور تمھارے خس و خاشاک میں گرتے ہوئے ان شراروں کو ہماری آہیں ہوا دیں گی اور جب شعلے

بھڑکیں گے تو ہم ان شعلوں کے اردگرد ناچیں گے ...... اُس روز پولیس بوڑھے کو گرفتار کر کے لے گئی۔ بڑھیا نے جب یہ خبر سُنی تو دردآمیز حسرت سے چیخ کر بولی۔ ''اب میری باری ہے، میرا خدا مجھے بُلا رہا ہے، میرا رسولﷺ مجھے بُلا رہا ہے، میرا دستگیر مجھے بُلا رہا ہے، میرا علی مجھے بُلا رہا ہے۔''

قیدو بند اور ہندوستانی سیاست کی پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی جذباتی الجھنوں کے باوجود:

''یہ شعلہ بوڑھے کے دل میں برسوں بھڑکتا رہا۔ جب اُس نے سُنا کہ محمد علی پردیس میں چل بسے ہیں تو اس بھوبھل پر ایک بگولا چھپٹا، چنگاریوں کا ایک مینار بلند ہوا، یہ مینار اُس کے ذہن کی وسعتوں میں رقصاں و جولاں رہا۔ اُس روز اُسے کسی پہلو قرار نہیں ملتا تھا، چاند کو دیکھ کر کہتا تھا۔ ''میرے بچے، تیرا سپہ سالار مر گیا۔'' اپنے اداس خلافتی ساتھیوں کو دیکھ کر کہتا تھا۔ ''میرے رفیقو! تمھارا سرپرست چل بسا۔'' مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے کہا۔ ''میاں جی، ہماری ملّت کا سُہاگ لُٹ گیا۔''

قیادت کے فقدان کے باعث بوڑھے کو اپنی زندگی میں تحریک بار آور ہوتی نظر آئی تو وہ جنونِ عشق کے ساتھ جذبۂ آزادی کے شعلوں کی آنچ میں اپنے بیٹے کو کندن بنانے میں ہمہ تن منہمک ہوگیا:

''سرما کی طویل راتوں میں جب کڑوے تیل کے دیئے کی لو دھوئیں کی مخنی لہریں چھوڑتی اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی چنگیروں اور چھاجوں کے پیچھے نڈیاں سنگیت سبھا جماتیں تو وہ چاند کو اپنے پاس بٹھا لیتا، اُسے خلافت کے زمانے کے قصّے سناتا، اُس سے وعدہ لیتا کہ جب ایک مرتبہ پھر یہ شعلہ بھڑکے گا تو وہ اس میں بے خوف کود جائے گا اور یہ نہیں سوچے گا کہ ابھی اُس کی عمر چھوٹی ہے یا اُس کے ماں باپ بوڑھے ہیں۔''

بوڑھے کے ذہن میں ایک ہی خیال جاگزیں تھا اور:

''اُس کے دل میں صرف ایک لگن تھی ..... کاش وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے خواب کی تعبیر دیکھ لے اور جیتے جی ایک مرتبہ پھر محسوس کر لے کہ ابھی غلاموں کے ذہنوں سے آزادی کا تصور محو نہیں ہوا۔ اس راکھ میں ابھی کئی سخت جان چنگاریاں چھپا رہی ہیں جن کو ہوا دینے کے لیے ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے اور وہ محمد علی ثانی اُس کے ذہن کے اُفق پر طلوع ہو چکا ہے۔''

یوں محمد علی جوہر کی وفات سے پیدا ہونے والا قیادت کا خلا بالآخر محمد علی جناح نے پورا کر دکھایا اور تحریکِ خلافت ایک مرتبہ پھر زندہ ہو کر تحریکِ پاکستان میں سرگرمِ کار ہوگئی۔ چنانچہ بوڑھے کا بیٹا چاند اسلام اور آزادی کے لیے اور اپنے محمد

علی کی اجازت سے فاشزم کے خلاف جنگ کے محاذ پر دادِ شجاعت دینے لگا۔ اُس روز بوڑھے کی تمام تر تمناؤں کی گویا تکمیل ہو گئی جس روز بغداد سے چاند کا خط آیا:

''میں نے حضرت پیر دستگیر سبحانی کے روضہ مبارک کی زیارت کی...... وہاں میں نے دُعا مانگی کہ اے اللہ مجھے اپنے رسول پاک ﷺ اور اپنے اس نیک بندے کی برکت سے اُس راہ پر قربان ہو جانے کی توفیق عطا فرما جو مجھے میرے ابا بچپن سے دکھاتے چلے آئے اور ابا جان، جب میں یہ دعا مانگ چکا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم محمد علی تشریف لے آئے ہیں اور میری دعا میں شامل ہو گئے ہیں۔''

''خط پڑھتے پڑھتے بوڑھے کی آواز بھرا گئی..... بوڑھا اُٹھ بیٹھا اور بڑھیا کے شکوک دُور کرنے کے لیے اس نے ایک لمحہ میں فقرہ مکمل کرنے کے کئی طریقے سوچ لیے اور بالآخر بولا۔

''جب وہ پورا چاند بن جائے گا تو اپنے آپ کو سورج کے حوالے کر دے گا۔''

''سورج؟'' بڑھیا چونک پڑی۔

''ہاں ہاں، ہمارا نیا محمد علی دُنیا کا سورج ہی تو ہے۔'' بوڑھا کامیاب ہو گیا تھا اور بڑھیا چونکے ہوئے اعصاب کے تناؤ کو مسکراہٹوں کی پھوار سے نرم کرنے لگی تھی۔''

یہ اپنی قوم کی اجتماعی تمناؤں سے ندیم کی جبلی وابستگی کا کرشمہ ہے کہ افسانے کے تینوں کردار بوڑھا، بڑھیا اور چاند تحریک آزادی کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے میں نئے محمد علی (قائداعظم) کے جان فروش پرستار اور تحریکِ پاکستان کے بے لوث سپاہی بن جاتے ہیں:

''لاہور میں ہمارے محمد علی نے ایک بڑا جلسہ کیا ہے۔ ایک روز بوڑھے نے کہا۔ اور انگریز کو بتایا ہے کہ ہندو مسلمان کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اُن کا مذہب، چال ڈھال، رہن سہن، لباس خوراک سب کچھ الگ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو اور جہاں جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو، اس طرح ہندوستان میں رہنے والے دو بھائی جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں الگ الگ ہو کر چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ 'معقول بات ہے' بڑھیا نے کہا اور اس کی مسکراہٹ کا محیط وسیع ہو گیا۔ 'جیتا رہے ہمارا محمد علی، جیتے رہیں وہ سب لوگ جو آزادی کے عاشق ہیں' بوڑھا بولا۔

'اور جیتا رہے میرا چاند جسے سمندر پار بھی اپنا چاند تارا نہیں بھولا۔' بڑھیا نے غرور سے کہا۔''

احمد ندیم قاسمی کے یہ دو افسانے اردو کے جدید افسانوی ادب میں ہندی مسلمانوں کے جداگانہ قومی طرز احساس کے بہترین ترجمان ہیں۔ ''سُرخ ٹوپی'' اگر تحریکِ خلافت کے سامراج دشمن رُخ کی معنی خیز علامت ہے تو ''ارتقاء'' کی پوری فضا میں ہندی مسلمانوں کا جداگانہ تہذیبی وجود سانس لے رہا ہے اور چاند تارے کی علامت نے تحریکِ خلافت کو تحریکِ پاکستان سے آ ملایا ہے۔

''ارتقاء'' کی تخلیق کا زمانہ ندیم کے ہاں عملی سیاست میں شدید ترین انہماک کا زمانہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم بلند کیے ندیم جس علاقے میں سرگرمِ عمل تھے وہ نہ صرف انگریز کے خوشامدی سفاک ترین جاگیرداروں کا گڑھ تھا بلکہ پنجاب کے متکبر حکمران خضر حیات ٹوانہ کا حلقہ انتخاب بھی تھا۔ نتیجہ یہ کہ یہاں تحریک کے کارکنوں پر جبر و تشدد انتہائی شدید تھا۔ قائداعظم اور پاکستان کے حق میں نعرہ لگانے والوں کا حوالات میں بند کر دیا جانا اور مسلم لیگ کا جھنڈا اُکھاڑ دینے والوں کا انعام و اکرام سے فیض یاب ہونا معمول کی بات تھی۔ استبداد کی روز افزوں بلند ہوتی لہر کے باوجود ندیم کو انگریز سامراج کی پسپائی اور جاگیرداری استحصال کی موت ناگزیر معلوم ہوتی تھی ہر طرح کے استحصال سے پاک معاشرہ کی تلاش میں فکر و تخیل کی یہی نقش گری ہمیں اس دور کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ افسانوی مجموعہ ''آس پاس'' کے چند منفرد افسانوں میں کہانی اور پلاٹ پر فکر و تخیل اور جذبہ و احساس کی چھوٹ کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''چلتے رہو میرے تھکے ماندے ساتھیو، تمھیں ستاروں کا ساتھ دینا ہے، اندھیرے کی شکایت نہ کرو، راتیں اکثر اندھیری ہوتی ہیں..... مجھ سے کوئی بات کرو ہمدمو، دیکھو، الاؤ کا دائرہ لرز رہا ہے اور ستارے ڈوبے جا رہے ہیں، رات کا نظام زوال پذیر ہے، اب اس تخریب سے ایک نئے اور روشن نظام کی تعمیر ہوگی، اسی تعمیر میں ہم اپنا خون کھپاتے جا رہے ہیں، ہم ایسے دنوں سے تھک چکے ہیں جو صرف بلندیوں کی مستعار شعاعوں سے روشن رہ سکتے ہیں۔ ہمیں ایک ابدی دن چاہیے جس کی روشنی ہمہ گیر ہو اور جس کی وسعت کائنات پیما ہو۔''

اس افسانے میں ظلمات سے نور کی جانب کٹھن اور صبر آزما سفر ایک موسیقار، ایک فلسفی، ایک مصور اور ایک شاعر ایک ساتھ طے کر رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب کردار افسانے کے واحد متکلم کی اپنی تخلیقی شخصیت کے مختلف پہلو ہوں۔ ندیم اس دور میں اپنے دل و دماغ کی ساری توانائیوں کے ساتھ اسلامیانِ ہند کے اجتماعی خواب کی صورت گری میں محو تھے۔ اُن کے ناولٹ ''پت جھڑ'' کے تیسرے باب کا عنوان ہے: 'پاکستان زندہ باد'۔ اس ناولٹ میں جاگیرداروں کی انگریزوں سے فاداری بشرطِ استواری اور عوام کی تحریکِ پاکستان کی پُرزور حمایت کے درمیان انتہائی زور دار کشمکش کو رفتہ رفتہ جنگ و جدل میں بدلتے دکھایا گیا ہے:

> ''انھی دنوں معلوم ہوا کہ کوئی لیگ نام کی ٹولی نکلی ہے جو انگریز کو ملک سے نکال دینا

چاہتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن مانگتی ہے۔ میں نے سوچا یہ مانگ کچھ ایسی غلط تو نہیں، اور پھر انگریز کے سے بلند اور عظیم مینار کو نیچ سے تراش کر خلا میں لڑھکانے کا معاملہ تھا۔ ذیلدار لیگ کی اس مانگ کا دشمن تھا کیونکہ ٹوانے کا راج تھا اور ٹوانے اور ہندوؤں سکھوں کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ پہلے بیگو نے جھنڈا اٹھایا۔ پھر میں بھی شامل ہو گیا۔ موچی، نائی، دھوبی اور میراثی آ ملے۔ فوجی جوان چھٹی پر آئے تو خفیہ طور پر ہمیں بہت کچھ سکھایا سمجھایا اور بہت سا چندہ بھی دے گئے۔ ہم نے پرائمری لیگ بھی بنالی اور "ملک جاں باز" اس کے صدر چنے گئے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں ہم نے بیٹھ کر بہت سے فیصلے کیے اور جب ہم باہر نکلے تو چوکیدار نے میرے پاس آ کر کہا کہ ذیلدار مجھے چوپال پر یاد کر رہا ہے۔ سب کے چہرے اُتر گئے، مگر بیگو ایک ہی لفنگا تھا، جھنڈا اٹھا کر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور کہا "میں جانتا ہوں ذیلدار تم سے کیا کہے گا۔ اس کے سارے سوالوں کا جواب یہ جھنڈا ہے۔ تم پڑھے لکھے لوگ دوٹوک بات نہیں کر سکتے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم نے کرسی تم ہی کو دی ہے۔ خبردار، یہ جھنڈا جھکنے نہ پائے ورنہ خدا کی قسم جاں باز، مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

سب لیگیوں نے مل کر اللہ اکبر کا ایک نعرہ لگایا اور میں جھنڈا لہراتا ذیلدار کے ہاں چلا۔ چوپال میں مونچھوں اور طروں کا ایک ہجوم تھا اور ذیلدار کا لکیروں بھرا ماتھا مجھے اپنی موت کا وارنٹ معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے مجھے دور ہی سے للکارا "جھنڈا وہیں پھینک دو۔"

میں نے کہا "جھنڈے پھینکے نہیں جاتے، اونچے کیے جاتے ہیں۔"

عوامی عزم و عمل کا یہ مظاہرہ دیکھتے ہی:

"مونچھوں اور طروں نے سرگوشیاں کیں اور میں بڑھتا چلا آیا اور جب میں ذیلدار کے مونڈھے کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے میں نے جھنڈے کی بجائے خنجر تھام رکھا ہے۔ "پیچھے ہٹ کے بات کرو۔" اس نے کہا اور میں بانس کے سرے پر لپٹے ہوئے جھنڈے کو درست کرنے لگا۔

"وہ بولا "دیکھو جاں باز" یہ لیگ والا تماشا یہاں نہیں چلے گا۔ میں نے چالیس برس تک انگریز کا نمک کھایا ہے اور اب میں اس سے نمک حرامی نہیں کروں گا۔ سمجھے؟ تم انگریز کے ٹکڑوں پر پلے ہو۔ پانچ برس تک تم نے مفت کی روٹیاں کھائی ہیں اور تنخواہیں لی ہیں اور تمھاری ماں بہن نے گل چھرے اُڑائے ہیں، سمجھے؟..... اور اب تمھیں یہ لیگ پیاری لگنے لگی، کیوں بھئی؟ کون

سے موتی نکلے ہیں اس میں؟ آٹھ جماعتیں پڑھ لینے اور سمندر پار ہو آنے سے تمھاری عقل بڑھنی چاہیے تھی مگر معلوم ہوتا ہے تم بالکل کنگال ہو کر آئے ہو؟ انگریز کو گالی دیتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کہو تو مولوی جی کو بلوا کے بتا دوں کہ اپنے حاکم سے بغاوت کرنا کفر میں شامل ہے اور انگریز تم پر حاکم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انگریز اچھا لگتا ہے، سمجھے؟ اور دیکھو! میرے گاؤں کا ایک ایک ووٹ ٹوانے کو جائے گا اور جو ووٹ نہیں دے گا اُسے اپنی عزت بلکہ جان تک دینی ہوگی''۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے حقے کی نے اپنی انگلیوں میں تھام لی۔ پھر اوپر پھڑ پھڑاتے ہوئے پرچم کو دیکھا اور ہنس کر بولا ''جھنڈا بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ کہو تو میں ابھی اپنا تہبند اتار کر بانس پر لٹکا دوں۔ جھنڈا لیے پھرتا ہے ماں کا۔ نیا ملک بنوانے چلا ہے۔ گھر میں چنے کی دال تک نہیں اور ٹوانے کے منہ آتا ہے جس کے کتے تک بکرے کھاتے ہیں اور ریشم پر سوتے ہیں..... اب جا یہاں سے اور یہ جھنڈا جا کر کہیں چھپا دے۔ میرے گاؤں میں یہ جھنڈا پھر کبھی دکھائی دیا تو نہ تمھاری خیر ہے نہ اُس بیگو حرامزادے کی۔''

میں اب جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مسجد کی محراب کی اوٹ سے بیگو نکلا اور وہیں سے پکارا ''اے ملک! زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ کھال ادھیڑ دوں گا تیری..... ہماری راہ میں روڑا اٹکایا تو کچا چبا لوں گا تجھے!''

چوپال میں موجود سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، صرف ذیلدار پلنگ پر بت بنا بیٹھا رہا اور جب بیگو نے چوپال پر آ کر مجھ سے جھنڈا چھین کر اپنے کندھے پر رکھ لیا تو ذیلدار نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا ''تمھیں کس نے بلایا تھا یہاں؟ کمینے!''

اور بیگو نے بڑے اطمینان سے جواب دیا ''کمینے تو آپ ہیں ملک صاحب، میں کس لائق ہوں۔''

فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ذیلدار ہی نے اپنے ساتھیوں کو دست درازی سے روکا اور کہا ''تم کیوں پلید کرواتے ہو ہاتھ، اس کام کے لیے سرکار نے ایک محکمہ جو کھول رکھا ہے۔''

اور سچ مچ ذیلدار نے اس محکمے سے فائدہ اٹھایا۔ دو تین ہی روز بعد اچانک بیگو کے گھر پر چھاپا پڑا اور ایک دروازے کے پیچھے سے ایک فوجی پستول برآمد کر لیا گیا.......۔ اس نے چوپال میں چیخ چیخ کر کہا کہ پستول میرا نہیں، یہ دھوکے سے میرے ٹوٹے ہوئے کواڑ میں سے اندر

گرادیا گیا ہے۔ مگر تھانیدار ''فرد برآمدگی'' تیار کرنے کے بعد پرچہ کاٹ رہا تھا اور سارا گاؤں دم بخود کھڑا تھا۔ اچانک ذیلدار اٹھ کر بیگو کے پاس آیا اور ہتھکڑیوں کو چھو کر بولا ''اب تو کنگن پہن لے حرامزادے۔'' اور بیگو نے ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے دونوں ہاتھ اس زور سے ذیلدار کے جبڑے پر دے مارے کہ ذیلدار تیوار کر رہ گیا۔ اور جب بیگو کو پیٹا جانے لگا تو میں بھاگ کر بیگو کے گھر گیا، جھنڈا اٹھایا اور چوپال کی طرف بھاگا۔ اُس وقت وہ لوگ بیگو کو ساتھ لیے چوپال سے باہر آ گئے تھے اور تھانے کو جا رہے تھے۔ میں نے جھنڈے کو بلند کر کے نعرہ لگایا تو بیگو نے جواب میں اس زور سے اللہ اکبر کہا کہ تھانیدار اور اس کا گھوڑا دونوں بھڑک اٹھے۔

اور اگرچہ بعد میں بیگو کو جیل بھیج دیا گیا مگر الیکشن کے گیتوں میں اس کا ذکر بار بار آتا تھا اور غازی خان بیگ زندہ باد کے نعرے ہر جلسے میں سنائی دیتے تھے۔

بیگو کی گرفتاری کے بعد مجھے سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن جو شخص چند روز پہلے انگریز کی خاطر گولوں اور مشین گنوں سے کھیلتا رہا ہو وہ چاند تارے کا جھنڈا اٹھا لے تو بھلا ایک نُونے چھوٹے پستول سے کیسے ڈرے گا۔ جلوسوں اور جلسوں کا ایک طوفان امڈ پڑا۔''

چنانچہ وہ ساعتِ سعید آ پہنچی:

''جب ریڈیو پر خبر آئی کہ سرکار برطانیہ نے پاکستان کی منظوری دے دی ہے تو اُس روز سارے کا سارا گاؤں پاکستانی ہو گیا۔ رات بھر ناچ گانے کے جشن رہے۔..... اور ۱۴۔ اگست کو رات ایک بجے ریڈیو پر اعلان ہوا کہ پاکستان بن گیا۔ سب نے بڑے جوش و خروش سے نعرہ لگایا ''پاکستان زندہ باد''۔ دے فائر پر فائر اور دے گولے پر گولے۔ پوری فضا میں خوشی گونج رہی تھی۔ رات بھر سارا گاؤں جاگتا رہا۔ دُور کے گاؤں والے ناریوں سے اشارے کرتے رہے اور ہم ناریوں کو جلا بجھا کر جواب دیتے رہے۔ لڑکیوں نے ڈھولک پر گیت گائے۔ نوجوانوں نے ناچتے ناچتے گلیوں کی مٹی آندھی کی طرح اُڑا دی۔ میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ اب بیگو کی رہائی کا بھی یقین ہو گیا تھا، اس لیے اس کی بیوی سال بھر کی گوشہ نشینی کے بعد باہر آئی اور عورتوں کے ہجوم میں بیٹھ کر ایسا ماہیا الاپا کہ خدا یاد آ گیا! ٹوٹتی رات کو ہم سب سوئے اور جب صبح کی نماز کے لیے جاگے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ راتوں رات زمیندار نے چوپال کی چھت پر اتنا اونچا جھنڈا گاڑ دیا تھا، اور جھنڈے کا ریشم اتنا باتونی اور بے چین تھا کہ ہم سب کے جھنڈے گرد ہو گئے۔ میں مسجد کے صحن میں داخل ہوا تو مجھے سب سے پہلے مبارکباد کہنے والا زمیندار ہی تھا۔ ''الحمد

للہ" اُس نے کہا۔ "یہ سب تم جوانوں کا کمال ہے ورنہ ہم بڈھے کھوسٹ کیا کر سکتے تھے، پگڑی
تھامے پھرتے ہیں ہم لوگ تو۔ جی نہیں مانتا تھا پر ٹوانہ کا ساتھ دیتے رہے، اور جاں باز بیٹا، آج
پہلی بار تمھی سے ایک راز کہہ دوں۔ میں نے اپنا ووٹ ٹوانے کے خلاف ہی ڈالا تھا۔"

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک عوامی جشنِ مسرت کی صورت میں قیامِ پاکستان کا خیر مقدم کرنے والے ان مسلم لیگیوں میں اِس علاقے میں تحریکِ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن زمیندار بھی شامل ہے۔ یونینسٹ ٹوانوں کے کاسہ لیس یہ نمبردار اور ذیلدار قیامِ پاکستان کے بعد بھی اس لیے سیاہ وسفید کے مالک بن بیٹھے، متروکہ املاک کی لوٹ مار سے شادکام ہوئے اور اِن کے رعب و دبدبے اور اثر ورسوخ میں ذرا برابر کمی نہ آئی کہ نئی نظریاتی مملکت میں بھی وہی فرسودہ سامراجی انتظامی ڈھانچہ برقرار رہا۔ 'منزل اُنھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے' کے مصداق اِن سامراجی کارندوں نے تحریکِ پاکستان کے جن بے لوث کارکنوں کو جھوٹے الزامات پر جیلوں میں ڈلوایا تھا وہ بدستور قید و بند کی سختیاں ہی سہتے رہے۔ چنانچہ ندیم کے اِس افسانے کے آخری حصے میں اِس فرسودہ نظام کو تحریکِ پاکستان کے خواب وخیال کے مطابق تبدیل کر کے رکھ دینے کی عوامی مہم کے مسلسل زور پکڑتے جانے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ یہیں سے ندیم کے ہاں سیاسی آزادی کو ہمہ جہت حقیقی آزادی میں بدلنے کی فکری مہم شروع ہوتی ہے جو بہت جلد انسانی اخوت ومساوات اور معاشرتی عدل وانصاف کے اسلامی تصورات کی روشنی میں پاکستان کی معاشرتی اور اقتصادی تعمیرِ نو کی سیاسی جدوجہد بن جاتی ہے۔

قیامِ پاکستان کی بشارت ندیم کے لیے ایک ایسے جہانِ نو کی تخلیق سے عبارت تھی جہاں انسان کی ان مٹ قوتِ تخلیق اور لامحدود قوتِ تسخیر کے اپنی آخری حدوں تک بڑھنے، پھیلنے کے امکانات کا در وا ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک نئی دُنیا اور اُس میں بسنے کے لیے ایک نئے آدم کے تصور میں خیال وخواب کی نقش گری میں منہمک رہے۔ ہر چند فسادات کی وحشت و بربریت نے صبحِ آزادی کو دُھواں دُھواں کر دیا تھا مگر اس عالم میں بھی ندیم کی رجائیت کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ انھوں نے فسادات کی تمام تر ذمہ داری پسپا ہوتے ہوئے برطانوی سامراج پر ڈال دی۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو صبحدم قیامِ پاکستان کی خوشی میں اُن کا لکھا ہوا قومی ترانہ ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوا۔ اُنھوں نے نہ تو کبھی 'بٹوارے' کا لفظ استعمال کیا اور نہ ہی 'تقسیم' کا۔ وہ ہمیشہ قیامِ پاکستان کو عالمی اُفق پر ایک نئی دُنیا کے طلوع سے تعبیر کرتے رہے۔ اُن کی نظم "طلوع" میں قیامِ پاکستان کو آفتابِ تازہ کی بشارت سے تعبیر کیا گیا ہے:

کلی چٹک بھی چکی، پھول رنگ لا بھی چکا
وہ رنگ جس کو جہاں نے لہو کا نام دیا
مہیب رات شفق میں نہا کے آئی ہے
مہیب رات کا آغاز تھا اگر غازہ

مہیب رات کا انجام بھی حنائی ہے
بُجھا بُجھا سا نہ دیکھو شہاب پاروں کو
یہ اک عجیب سا احسانِ کبریائی ہے
جو آفتاب دیا ہم کو، لالہ فام دیا (۱۶ اگست ۱۹۴۷ء)

احمد ندیم قاسمی کے خیال میں پاکستان کا قیام دنیائے انسانیت پر خالق کائنات کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس "احسانِ کبریائی" کا فیضان ایک ہمہ گیر انقلاب ہے۔ چنانچہ:

ہم آفتابِ ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
تو ایک روز عظیم انقلاب کاٹیں گے
ہم انقلاب ضمیرِ جہاں میں بوئیں گے
زمیں پہ خلدِ بریں کا جواب کاٹیں گے (دراتی)

اور یوں وہ طلوعِ آزادی کے ساتھ ہی پاکستان کے اندر یہ انقلاب برپا کرنے میں سرگرمِ عمل ہو گئے۔ احمد ندیم قاسمی نے سجاد سرور نیازی کے سوانحی خاکے میں لکھا ہے کہ: "۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کو جب رات کے بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو کو پاکستان براڈ کاسٹنگ سروس میں بدلنا تھا تو پشاور ریڈیو اسٹیشن کا سارا اسٹاف اسٹیشن کے لان میں جمع تھا۔ سٹاف کے ایک رکن شوکت نے عمارت کی چھت پر کھڑے ہو کر ریوالور سے چند ہوائی فائر کر کے آزاد پاکستان کے قیام کا اعلان کیا۔ سرور بھائی نے سبز ہلالی پرچم لہرایا اور اس کے بعد ایک گھنٹے کا وہ ریڈیو پروگرام شروع ہوا جو میری زندگی کی چند لطیف یادوں میں سے ایک عزیز ترین یاد ہے۔ آزادی، قیامِ پاکستان اور قائداعظم کی عظیم رہنمائی کے موضوع پر سبھی ترانے میں نے لکھے، سبھی کی دھنیں سرور بھاوی نے ترتیب دیں اور ان میں سے ایک یا دو ترانے خود سرور بھائی نے گائے۔"(۳) ندیم کا ضخیم مجموعہ کلام "جلال و جمال" قیامِ پاکستان کے آس پاس ہی شائع ہوا تھا۔ اس میں حرفِ آغاز کے انداز میں "میرا فنی نظریہ" کے عنوان سے ندیم کا ایک مفصل مقالہ شامل ہے۔ یہاں اُنھوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ اُن کی:

"مذہبی رنگ کی شاعری مولانا ظفر علی خاں اور پھر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی بازگشت تھی، اسلامی لٹریچر بہت وسیع ہے اور مجھے اس کے گہرے مطالعہ کے وافر مواقع نہیں ملے، اس لیے میں اس صنف میں کسی نوع کی انفرادیت نہ پیدا کر سکا، مگر آئندہ چل کر اس رنگ میں نہایت بھرپور انداز میں لکھنا میری عزیز تمناؤں میں شامل ہے اور کیا عجب ہے کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں آئندہ اپنی نظموں میں پیش کر سکوں۔

..... میں نے جو کچھ کہا، وہ احساس کی اِس خاص رو سے مجبور ہو کر کہا جسے ''روحانی نغمگی'' سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا''۔ (۴)

خالق کائنات کی تلاش اور تجسس بھی اِس دور کی شاعری کا ایک ایسا موضوع ہے جس کی جانب ندیم کا فکر و تخیل بار بار پلٹتا ہے۔ وہ اپنی نظم ''تذبذب'' کو یوں ختم کرتے ہیں:

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک
کہاں خرد کی اڑانیں حریمِ ذات کہاں؟
تُو ذرّے ذرّے میں ہے اور کہیں نہیں ملتا
ترے وجود میں قیدِ تعینات کہاں؟
کہاں وہ زندہ و پائندہ ، حُسنِ لامحدود؟
مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں؟

احمد ندیم قاسمی اپنے گرد و پیش کی دنیا میں ایک مادی اور روحانی انقلاب کی تمنا میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ اُن کے معاصرین میں انقلاب کی صدائیں بلند کرنے میں مصروف شاعروں اور ادیبوں میں 'الحاد کی گرم بازاری' کیوں ہے؟:

''انقلابی شاعروں کی ایک خصوصیت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ انھیں خدا سے کیوں بیر ہے؟ اگر مذہب کی ابتدائی یعنی حقیقی ماہیت کو پرکھا جائے تو یہ ایک ایسے کیمیاوی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو ہماری زندگی کو درندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام اور اپنی ذات کی طہارت سکھاتا ہے، مذہب اگر خود فکری کی نشوونما میں کسی نوع کی مزاحمت کر سکتا..... تو مذہب، مذہب نہ رہتا، فاشستی احکام کا پلندہ بن کر رہ جاتا۔ مذہب ہمیں بداخلاقی ذہنی آوارگی اور انسانیت دشمنی کی یقیناً اجازت نہیں دیتا اور اگر خود فکری و خود شناسی ہر نوع کی آزاد خیالی پر مبنی ہے تو پھر الحاد بھی تو خود فکری کا کوئی قابلِ فخر نتیجہ نہیں۔ مادہ کی قوت مسلم، لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پسِ پردہ جو ایک غیر محسوس حسن کار فرما ہے، اس سے ایک سچا شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا اور شاعری کا سب سے بڑا معجزہ عالمگیر حسن کا احساس ہے۔ الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا ذہن ہماری ہر حرکت کی اولین تخلیق گاہ ہے۔ جنس ہو یا انقلاب، مذہب ہو یا الحاد ہم ہر حالت میں اپنے ذہن کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور فکری شاعری ہی ہماری ذہنی تربیت میں صحیح طور پر معاون ہو سکتی ہے، ذہنی تربیت کا مسئلہ ایک نہایت اہم اساسی مسئلہ ہے اور خدا کا شکر

ہے کہ اقبال نے دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ہمارے ہاں فکری شاعری کو رواج دے کر ہم نوجوانوں کے سامنے امکانات کی وسیع شاہراہیں کھول دی ہیں۔"(۵)

ہمارے ہاں اقبال کی شاعری نے نئے امکانات کی جو شاہراہیں روشن کی تھیں اُن پر رواں دواں احمد ندیم قاسمی سبک خرامی کے ساتھ برطانوی ہند سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ برصغیر کے اشتراکی دانشوروں نے اس اُمید کے ساتھ احمد ندیم قاسمی کو پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی قیادت سونپی تھی کہ وہ اُن کے مذہبی مزاج کو آسانی کے ساتھ سیکولر مزاج میں تبدیل کر سکیں گے مگر انھیں اس مہم میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ندیم کے مجموعہ کلام "شعلہ ءگل" کے آغاز میں "ایک نیا منصور" کے عنوان سے ممتاز حسین کی جو تحریر شامل ہے اُس میں بھی اُنھیں ندیم کے "مذہبی مزاج" کو سائنسی مزاج میں بدلنے کی آزمائش درپیش ہے:

"تھوڑا سا ہم دونوں کا اندازِ نظر مختلف ہے لیکن وہ جزوی اختلاف زندگی اور فن کے میدان میں اتنا غیر اہم ہے کہ میں نے آج تک اُس پر غور بھی نہیں کیا کہ یہ شخص جو انقلاب کا نقیب، ارتقاء کا پرستار، ظلم و استحصال کا مخالف اور انسانیت کا شیدا ہے ایک آدھ باتوں میں مجھ سے کچھ مختلف رائے رکھتا ہے۔..... بہر حال اب جبکہ یہ مجموعہ شعلہ ءگل "کتاب الطواسین" ہی ٹھہری تو اس بات کے اظہار میں حرج ہی کیا ہے جو میرے اور ان کے طریقِ فکر میں تنوع پیدا کرتی ہے، جو مختلف راہوں کو ایک ہی منزل سے ملاتی ہے۔ میں اس کائنات میں صرف ایک ہی طاقت کو دیکھ پاتا ہوں۔ وہ طاقت انسان کی ہے جو باوجود جزوِ فطرت ہونے کے فطرت کا خالق بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حیاتِ فطرت کے ارتقا کی ایک حسین اور ابھی تک کسی قدر پُر اسرار تخلیق ہے لیکن اس تخلیق سے زیادہ شاندار انسانیت کی تخلیق اور انسان کا ارتقاء ہے اور یہ کارنامہ حضرتِ انسان کا اپنا ہے۔"(۶)

یہاں ممتاز حسین نے اپنے 'طریقِ فکر' اور احمد ندیم قاسمی کے اندازِ نظر میں جس 'تنوع' اور جن 'مختلف راہوں' کا ذکر کیا ہے اُن میں کبھی یکسانیت پیدا نہ ہو سکی۔ اُن میں فاصلہ مسلسل بڑھتا ہی چلا گیا۔ ممتاز حسین، سجاد ظہیر اور اُن کے مارکسی ہم نواؤں کو کائنات میں صرف ایک ہی طاقت نظر آتی ہے اور وہ ہے انسان۔ احمد ندیم قاسمی انسان کو خالق جانتے ہیں مگر اُسے خالقِ اکبر کی تخلیق مانتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اِس کائنات کو ہمیشہ خالقِ مطلق کے عکس پر دیکھنے میں ہی کوشاں رہے۔ یہی اختلافِ فکر و نظر انجمن ترقی پسند مصنفین کے رفتہ رفتہ انتشار اور بالآخر اختتام کا سبب بن کر رہ گیا۔

حواشی

۱۔ پنجاب کے دیہاتی گیت اور بولیاں، احمد ندیم قاسمی، ماہ نو، کراچی۔

۲۔ انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۹ء۔

۳۔ میرے ہمسفر، احمد ندیم قاسمی، لاہور، ۲۰۰۲ء، صفحہ ۲۰۳۔

۴۔ جلال و جمال، نومبر ۱۹۹۱ء (دوسرا ایڈیشن)، صفحہ ۱۰۔

۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۴

۶۔ شعلۂ گل، صفحات ۱۵-۱۶

قیامِ پاکستان کے بعد

باب اوّل

احمد ندیم قاسمی اور سید سجاد ظہیر

اسلامی روشن خیالی اور اشتراکی مُلّائیت میں نظریاتی کشمکش

عبداللہ ملک نے اپنی ایک صحافتی تحریر میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کو پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری اس مصلحت کی بنا پر مقرر کیا گیا تھا کہ اُس زمانے میں اُن جیسی نیک نام ادبی شخصیت کی قیادت انجمن کی مجبوری تھی:

> ''جہاں تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی جنرل سیکرٹری شپ کا معاملہ ہے تو اس میں آپ کے نام کا قرعہ نکلنا اُس وقت کا تقاضا تھا۔ چونکہ اُس وقت کسی بھی ترقی پسند مصنف کو جو گذشتہ بارہ سال سے ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی یا ٹریڈ یونین میں متحرک تھا یہ عہدہ دینا اُس کی موت کا پروانہ تھا۔ اس لیے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ احمد ندیم قاسمی ابھی تک حکومتی نظر میں قدرے بے ضرر ہیں دوسرا اُن کا فکری رجحان ابھی واضح نہیں اس لیے موجودہ حالات میں اُن سے بہتر آدمی ہمیں کوئی بھی نہیں مل سکتا۔''(۱)

درج بالا اقتباس میں یہ بات درست ہے کہ اُس زمانے کے ترقی پسندوں میں احمد ندیم قاسمی سے زیادہ نیک نام شخص نادرو نایاب تھا مگر یہ بات سراسر غلط ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا ''فکری رجحان ابھی واضح نہیں'' تھا۔ اُن کا وہی مسلک تھا جو مولانا حسرت موہانی کا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ سجاد ظہیر سمیت بہت سے اشتراکی ترقی پسندوں کو اُمید تھی کہ وہ تلقین اور ترغیب سے بہت جلد مشرف بہ اشتراکیت ہو جائیں گے۔ یہ الگ بات کہ اشتراکی نظریہ سازوں کی یہ اُمید کبھی پوری نہ ہو سکی۔ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے ساتھ ہی کمیونسٹ نظریہ سازوں نے مارکسی اصولوں کی رُو سے اُن کی نظریاتی تعلیم و تربیت شروع کر دی تھی۔ لاہور میں اپنی روپوشی کے دوران ہی سید سجاد ظہیر خط و کتابت اور بات چیت کے ذریعے ان کے مزاج کو دینی کے بجائے سائنسی بنانے میں کوشاں ہو گئے تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے ڈاکٹر احسن اختر ناز کے ایک سوال کے جواب میں اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ:

''سید سجاد ظہیر میرے محترم تھے۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ مجھے اُن سے بعض اختلافات ضرور تھے۔ اُن سے میرا اختلاف اُس وقت پیدا ہوا جب سجاد ظہیر صاحب نے اپنے انڈر گراؤنڈ ہونے کے زمانے میں مجھے ایک طویل خط اِس مقصد سے لکھا کہ میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے اتنے ہی طویل خط میں اُنھیں جواب بھجوایا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہو سکتا اور میں صرف ترقی پسند ادیب رہنا چاہتا ہوں۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو میرا یہ خط پولیس کے قبضے میں آ گیا۔ جب میں گرفتار ہوا تو سید سجاد ظہیر کا خط پولیس کے پاس چلا گیا۔ دونوں خطوں کے انگریزی ترجمے کر کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھجوائے گئے اور جو شاید اب بھی سیکریٹریٹ کی فائلوں میں محفوظ ہوں گے۔ سجاد ظہیر صاحب سے میرا ایک اور اختلاف اُس وقت ہوا جب وہ اپنے تصور کے تحت پاکستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک کو تباہ و برباد کر کے اور پنڈی سازش کیس سے رہا ہو کر واپس بھارت چلے گئے تو انھوں نے دہلی کے ہوائی اڈے پر اُترتے ہی فرمایا: 'میں آج مادرِ وطن کی آغوش میں واپس آ گیا ہوں۔' اِس کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا: 'جب آپ کو مادرِ وطن اتنی عزیز تھی تو آپ یہاں پاکستان میں کیا کرنے آئے تھے؟''(۲)

سید سجاد ظہیر ہندوستان سے جس مہم پر پاکستان آئے تھے اُس پر بھی اِس کتاب میں، ایک اور مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اِس حقیقت کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ کہنے کو تو انجمن ترقی پسند مصنفین مختلف الخیال ادیبوں کا ایک متحدہ محاذ تھی مگر آغازِ کار ہی میں اِس تنظیم کی قیادت سید سجاد ظہیر اور اُن کے ہمنوا کمیونسٹ نظریہ سازوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور وہ ادیبوں پر انتہائی آمرانہ انداز سے اپنے مخصوص نظریات مسلط کرنے میں کوشاں رہے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی اسلامی اشتراکیت کو اشتراکی مُلّائیت میں بدلنے کی مساعی بھی اسی مہم کا حصہ ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنی روپوشی کے زمانے میں ندیم کو جو پہلا طویل اور مدلّل خط لکھا تھا اُس کا انگریزی ترجمہ اُس زمانے میں سرکاری خفیہ ایجنسی کے سربراہ میاں انور علی نے مغربی پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پر اپنی کتاب میں شامل کر رکھا ہے۔(۳) سید سجاد ظہیر نے اپنے خط میں احمد ندیم قاسمی کے مضمون ''احتجاج اور احتیاط'' کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ندیم صاحب کا یہ مدلّل اور مفصل مقالہ خدیجہ مستور کی ادارت میں کراچی سے شائع ہونے والے جریدہ ''روحِ ادب'' کی دسمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ندیم صاحب نے اس میں قدامت پرست اور رجعت پسند ادبی اور مذہبی حلقوں کی جانب سے ترقی پسند تحریک کے خلاف اُٹھائے گئے سوالات کا انتہائی مؤثر استدلال کے ساتھ جواب دیا تھا۔ یہ سوالات میاں بشیر احمد مدیر ''ہمایوں'' نے اپنے تین چار اداریوں میں اُٹھائے تھے۔ میاں صاحب کا مشورہ یہ تھا کہ ترقی پسند ادیب احتجاج ضرور کریں مگر ذرا احتیاط کے ساتھ۔ احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند ادیبوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ضرور احتجاج کریں مگر ایسا کرتے وقت احتیاط سے ہرگز کام نہ لیں۔ کیونکہ:

''یہی وہ مقام ہے جہاں پاکستان کے باشندے، سیاسی، معاشی، سماجی، تمدنی اور ادبی لحاظ سے دو جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں، اور ان کے درمیان ایک اتنی ہولناک خلیج حائل ہو جاتی ہے جو ایک فوری معاشی انقلاب کے سوا اور کسی قوت سے پاٹی نہیں جا سکتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے محبوب نوزائیدہ پاکستان کا مستقبل دھندلا کر رہ جاتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ کہیں ہم پاکستان کے لیے ایسا آئین تو مرتب نہیں کریں گے، جس میں خلفائے راشدین کی صاف ستھری جمہوریت کی ایک رمق تک نہ ہو اور ہم اپنے مطلق العنان مسلمان بادشاہوں سے جذباتی عقیدت رکھتے ہوئے ایک ایسی نئی قسم کی فسطائیت اور آمریت کے جنگل میں الجھ کر رہ جائیں جسے نہ اسلام سے علاقہ ہو نہ اشتراکیت سے، جو صرف چند منتخب گروہوں کے طبقاتی تحفظ کا ایک ذریعہ ہو۔''(۴)

احمد ندیم قاسمی جہاں مُلّائیت کو رد کرتے ہیں وہاں اسلام کی حقیقی انقلابی روح کی بازیافت چاہتے ہیں:

''جاگیرداری ہو یا سرمایہ اندوزی، دونوں میں غرض مشترک عوام کُشی اور معاشی و اقتصادی عدم توازن ہے اور اگر کارل مارکس کا نام سُن کر بدک اُٹھنا طبقہ اُمرا کا وتیرہ بلکہ جبلت بن چکی ہے تو اُنھیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی زبانی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اُٹھانا چاہیے جو کارل مارکس کی پیدائش سے چھپن برس پیشتر وفات پا چکے تھے۔ .... شاہ ولی اللہ نے یہ خیالات کسی خلوت میں بیٹھ کر محض حسنِ اتفاق سے نہیں سوچے تھے بلکہ انھوں نے گرد و پیش کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تاریخ کی ستم ظریفیاں ان کے چار طرف بکھری پڑی تھیں۔ مغلوں کی سلطنت کٹ اور بٹ چکی تھی۔ سارے ہندوستان پر جاگیردار قابض ہو چکے تھے اور انگریز لپکا چلا آ رہا تھا۔ اخلاقی حالت پست ہو چکی تھی اور زندگی کی آسودگیاں ایک مختصر سے طبقے کا اجارہ اور پیدائشی حق بن کر رہ گئی تھیں۔ اس وقت شاہ ولی اللہ نے معاشی انقلاب کا نعرہ بلند کیا تو ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے اور ان کے پنجے محض اس لیے اُتروا دیے گئے کہ وہ اپنا آتشیں قلم نہ تھام سکیں۔ اگر امام الہند کا یہ نعرہ اس وقت صحیح تھا تو آج اس سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ اگر اس وقت یہ انقلاب برپا ہو جاتا تو عین ممکن تھا کہ انگریز کے قدم اُکھڑ جاتے مگر جاگیردار اپنی ضد پر اڑے رہے، یعنی احتیاط برتتے رہے اور ملک کو فرنگی ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا۔''(۵)

احمد ندیم قاسمی اسی مضمون میں آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ:

''ہم مانتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہم میں سے چند ایک ادیب تقسیم کی حقیقی روح اور ثقافتی ضرورت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ ان ادیبوں کو انسان کی فطری کمزوری

اور واقعے کی فوری نوعیت کے مدنظر معاف کیا جا سکتا ہے لیکن اب تو پاکستان کسی بھی ادیب کے نزدیک فرقہ پرستی کا کارنامہ نہیں رہا بلکہ تمام ترقی پسند مانتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی اور اقتصادی خوشحالی ہی سے ان کی اور ان کے ساتھ کروڑوں عوام کی بہبود وابستہ ہے۔... ۱۵۔اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد کی تحریروں کو موضوع تنقید قرار دینا پرلے درجے کی تفرقہ اندازی ہے۔اب پاکستان کا وجود، پاکستان کی تعمیر، پاکستان کا روشن و نیک نام مستقبل کے ترقی پسندوں کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔"(۶)

یہ اُس زمانے کی تحریر ہے جب پاکستان میں ابھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا ہی نہ تھا۔انجمن کی لاہور شاخ کا مرکز ہندوستان میں واقع تھا اور پاکستان کے کمیونسٹ بھی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں کام کررہے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کی پاکستان سے وفاداری معرضِ شک میں تھی۔ایسے میں احمد ندیم قاسمی نے ترقی پسند ادیبوں کی حمایت میں ایک انتہائی مؤثر مقالہ سپرِدِقلم کیا تھا۔اس مقالے میں اُنھوں نے ترقی پسندی کے حق میں اپنے استدلال کی بنیاد اسلام کی حقیقی انقلابی روح پر رکھی تھی۔سجاد ظہیر اور اُن کے ہمسفر اشتراکی دانشوروں نے ندیم صاحب کے استدلال کو اپنے مارکسی استدلال کی نفی قرار دے کر پاکستانی سیاست اور معاشرت کو تجدید و ترقی کی راہوں پر ڈالنے کے بجائے زوال وادبار میں مبتلا کر دیا تھا۔

سجاد ظہیر کے زیرِ بحث خط کو پڑھتے وقت مجھے غالب کا مشہور مصرع 'مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی' بیساختہ یاد آیا۔وہ پاکستان میں کمیونسٹ سیاست کو پاکستانیت سے نفرت کی بنیاد پر پروان چڑھانا چاہتے تھے۔اس لیے اُنھیں ندیم صاحب کے مضمون میں ''محبوب پاکستان'' کے لفظ بہت کھٹکے۔مزید یہ کہ ندیم صاحب نے اُن ترقی پسندوں اور اشتراکیت پسندوں پر تنقید کی ہے جو پاکستان کے ریاستی وجود کو تسلیم کرنے سے انکاری رہے ہیں۔اس سے بڑھ کر ندیم صاحب کی جانب سے پاکستان میں اسلام کی حقیقی انقلابی رُوح کو بازیافت کرنے اور سرگرمِ عمل بنانے کی جدوجہد ہے۔ سید سجاد ظہیر اور اُن کے ہمنوا اشتراکیت کے فروغ کی خاطر ترکِ اسلام کو لازمی قرار دیتے تھے۔چنانچہ سید صاحب اس خط میں خلفائے راشدین کے عہد میں بھی اسلام کی حقیقی روح کی کارفرمائی سے انکاری ہیں۔اس باب میں اُن کا استدلال تعجب انگیز ہے۔وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی مثال سامنے لاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اُس دور میں بھی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ کے طرزِ فکر و عمل کو کماحقہٗ پذیرائی نصیب نہ ہوئی تھی۔میں یہ سوچتا ہوں کہ طلوعِ اسلام کے بغیر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہٗ اور اُن کی قابلِ صد تقلید تعلیمات کا منظرِ عام پر آنا ناممکنات میں سے تھا۔اگر جاہلیت کے اندھیروں سے اسلام کی نورانی فضاؤں میں سانس لیتے ہی ایسی انقلابی شخصیات پیدا ہوسکتی تھیں تو آج کے ترقی یافتہ دور میں اسلام کا وہ مادی اور روحانی انقلاب کیوں برپا نہیں ہوسکتا، حضرت ابوذر غفاری جس کے علمبردار تھے؟

میاں انور علی کی متذکرہ بالا کتاب میں سے سید سجاد ظہیر کے استدلال کو کامران اصدر علی نے اپنی انگریزی کتاب بعنوان ''سُرخ سلام'' میں زیرِ بحث لا کر پاکستان میں کمیونسٹ سیاست کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس کتاب کے تیسرے باب میں اس خط و کتابت کا تجزیاتی مطالعہ ختم کرتے وقت سجاد ظہیر اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی پاکستان اور اسلام کے باب میں تلخ نوائی اور منفی حکمتِ عملی کے باعث احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ساتھ بہت سے ترقی پسند دانشوروں اور سیاستدانوں کو بھی اشتراکی سیاست سے متنفر کر دیتے ہیں۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی آغاز کار ہی میں قیامِ پاکستان کو ایک تاریخی غلطی سے تعبیر کر کے خود ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کرتی ہے جس کے نتیجے میں پارٹی کو صرف کمیونسٹ مخالف پراپیگنڈے ہی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ حکومتِ وقت کو اسے پاکستان دشمن جماعت قرار دینے کا جواز ہاتھ آ جاتا ہے۔(۷) ایسے میں احمد ندیم قاسمی کا پاکستان میں ترقی پسند تحریک کا رہبر و رہنما بن جانا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔

حواشی

۱۔ قاسمی صاحب! تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، عبداللہ ملک، روز نامہ اوصاف، اسلام آباد بابت ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء

۲۔ ترقی پسند تحریک و صحافت، مکالمات، ڈاکٹر حسن اختر ناز، لاہور، ۲۰۰۳ء، صفحات ۶۔۷

3- The Communist Party of West Pakistan, in Action, Lahore, Government Pringing Press, 1952, Pp.311-320

۴۔ روحِ ادب، کراچی، دسمبر ۱۹۴۸ء، صفحہ ۱۰۶

۵۔ ایضاً، صفحات ۱۱۱۔ ۱۱۲

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۸۔

7- Surkh Salam :Communist Politics and Class Activism in Pakistan 1947-1972, Kamran Asdar Ali, Oxford, 2015, p.129:

"In a way, Qasmi's critique was a broader one and eventually led to many, including Qasmi himself, becoming dissatisfied with the CPPs hard-line politics. The CPP thus eventually came to be perceived as insensitive to the historical moment that the partition of British India had provided the Muslims of South Asia with the creation of Pakistan. The party, at this early stage of its existence, in its analysis, could only explain this phenomenon as a historical mistake and became reconciled to it as an interim phase, albeit a way station, that needed to be passed in order to arrive at real 'emancipation'. This tendency within the CPP eventually led to severe critique from other writers which gave fodder to the Muslim League government to wage its anti-communist propaganda and label the party as anti-state.

باب دوم

ڈاکٹر تاثیر کی ترقی پسند پاکستانیت

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اُن چند دانشوروں میں سے ایک تھے جنھوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے لندن میں ترقی پسند ادبی تنظیم کے امکانات پر تبادلہ خیالات کی خاطر وقتاً فوقتاً مل بیٹھتے تھے۔ سید سجاد ظہیر اور ملک راج انند سمیت انگلستان میں زیرِ تعلیم متعدد ہندوستانی طالب علموں کی ان غیر رسمی ملاقاتوں اور باتوں نے بہت جلد اُس ترقی پسند ادبی تنظیم کی شکل اختیار کر لی تھی جو ۱۹۳۵ء میں برطانوی ہند کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے مقبولِ خاص و عام ہو گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب لاہور میں ترقی پسند ادیب پاکستان میں انجمن کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینے کی خاطر جمع ہوئے تو ان میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی موجودگی ایک قدرتی امر تھا۔[1] یہ وہ زمانہ تھا جب بھارت کی کمیونسٹ پارٹی نے سید سجاد ظہیر کو پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کر کے پاکستان بھیج دیا تھا۔ ہر چند سید سجاد ظہیر روپوشی کی زندگی بسر کر رہے تھے تاہم وہ اپنی خفیہ سرگرمیوں سے پاکستان میں ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے عکس پر ایک پاکستانی انجمن کی تشکیل و تعمیر میں کوشاں تھے۔ اس سلسلے میں ادیبوں کا پہلا اجلاس دسمبر ۴۷ء میں وائی ایم سی اے ہال لاہور میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد اس اجلاس میں شریک تھے۔ اُنھوں نے اپنی آنکھوں دیکھی واردات کے بیان میں لکھا ہے کہ اس اجلاس میں:

> ''تاثیر صاحب کو بھی شرکت کی دعوت تھی بلکہ انھیں مشاعرہ کی صدارت کرنی تھی۔ مشاعرہ رات کو تھا اور شام کے اجلاس کی نشست جاری تھی۔ ایک صاحب نے ایک ریزولیوشن ذریعہ تعلیم کے متعلق پیش کیا۔ مجھے ٹھیک الفاظ تو یاد نہیں مگر مفہوم کچھ اس طرح کا تھا جس سے اردو زبان کی قومی حیثیت پر زد پڑتی تھی۔ جب یہ ریزولیوشن پیش ہوا تو میں نے دیکھا کہ تاثیر صاحب کچھ سنجیدہ سے ہو گئے ہیں، انھوں نے دو تین دفعہ انگریزی میں ''یہ خطرناک چیز ہے'' کہا۔ تقریر ختم ہونے پر وہ سٹیج پر پہنچے اور ذرا جوش کے ساتھ ایک مختصر سی تقریر کی اور پھر ایک ترمیم پیش کی جس کا مقصد ریزولیوشن کے قابلِ اعتراض عنصر کو خارج کرنا تھا۔ جلسہ کے صدر حفیظ جالندھری تھے۔

انھوں نے بھی تاثیر صاحب کی ترمیم کی حمایت کی اور وہ کثرتِ رائے سے منظور ہو گئی۔"(۲)
منتظمین نے اِس جرم کی پاداش میں صدارت تو کُجا مشاعرے میں تاثیر صاحب کی شرکت تک کو ناممکن بنا دیا:

"تاثیر صاحب اپنے اسلامیہ کالج کے زمانے کے پرانے رفیق ڈاکٹر سعید اللہ صاحب کے ہمراہ مشاعرہ میں شرکت کے لیے اوپر ہال میں چلے گئے۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے، میں ابھی نیچے سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ تاثیر صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے پھر نمودار ہوئے اور آتے ہی بولے "لو بھئی میں بھی مشاعرہ میں شامل نہیں ہو رہا۔ چلو آؤ گھر چلیں" میں نے حیرت سے پوچھا..... "یہ کیوں؟" اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا، غصہ ان کے چہرے سے نمایاں تھا۔ ڈاکٹر سعید اللہ صاحب نے جو اُن کے ہمراہ واپس آئے تھے مجھے بتایا کہ مشاعرہ والوں نے بڑی نامعقول حرکت کی ہے۔ تاثیر صاحب جب گیٹ پر پہنچے تو وہاں ایک نوجوان کامریڈ نے تاثیر صاحب کو روک لیا اور ان سے ٹکٹ طلب کیا۔ تاثیر صاحب نے کہا۔ "مجھ سے کیسا ٹکٹ؟" اس نے اصرار کیا۔ اس پر تاثیر صاحب ذرا برہم ہوئے پھر انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا، ٹکٹ مانگنے والے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر پھر کھینچ لیا اور ایک دم مُڑ کر واپس چلے گئے۔"(۳)

اور یوں انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے ایک نامور بانی رُکن پر اپنے دروازے بند کر لیے۔ مجھے اِس سراسر آمرانہ طرزِ عمل کا بنیادی سبب اُن لوگوں کی رعونت نظر آتا ہے جنھوں نے انجمن پر کمیونسٹ آمریت مسلط کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر ایک ایسے ترقی پسند دانشور اور تخلیق کار تھے جو مسلمانوں کے ادب کی اُس ترقی پسند روایت کے علمبردار تھے جو اقبال کے ہاں جدید عصری، علمی، ادبی اور فکری تحریکوں سے گہری رسم و راہ کی بدولت ایک نیا رنگ و آہنگ اختیار کر چکی تھی۔ اقبال ہی سے اپنی گہری ذاتی اور نظریاتی وابستگی کے زیرِ اثر وہ سچی اسلامیت اور اپنے روئیں روئیں میں رچی بسی ہوئی پاکستانیت کے ترجمان تھے۔ چنانچہ جب ادبی اجتماع میں لسانی منافرت کے بیج بونے کی کوشش کی گئی تو وہ تڑپ اُٹھے۔ آن کی آن میں اُن کے درد و کرب نے اجتماع میں شامل افراد کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر تاثیر کے استدلال کی روشنی میں لسانی منافرت پر مبنی قرارداد رد کر دی گئی۔

اسی زمانے میں چند بھارتی ادیبوں نے کشمیر کے باب میں بھارتی نقطۂ نظر کی تائید و حمایت میں ایک بیان شائع کیا۔ اِدھر سید سجاد ظہیر نے اشتراکیت کے ترجمان رسالہ "نیا زمانہ" میں کشمیر سے متعلق اپنے اداریہ میں کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کی حمایت میں یہاں تک لکھ دیا کہ ہر ایمان دار آدمی کو کشمیر پر بھارت کے تسلط کو خوش دلی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے:

''کشمیری عوام اپنے وطن اور آزادی کو بچانے کے لیے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں ہر جمہوریت پسند کو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ موجودہ حالات میں ہر ایماندار شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انڈین یونین کی حکومت کے تمام اقدامات کی حمایت کرے گا جو کشمیری عوام کی امداد کے سلسلے میں کیے جا رہے ہیں..... ہندوستانی حکومت نے اپنی جمہوری روایات کا زندہ ثبوت پیش کر دیا ہے..... کشمیر کی سرزمین پر ہندوستانی فوجیں ایک جمہوری نصب العین کے لیے لڑ رہی ہیں.... موجودہ تباہی سے نکلنے کا صحیح راستہ یہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری حکومت کو سامراجی ایجنٹوں کے ساتھ تعاون کرنے سے روکیں۔''(۴)

ایسے میں جب ہندوستانی ادیبوں کی جانب سے کشمیر پر بھارتی قبضے کی پرجوش حمایت کا بیان سامنے آیا تو اس کے ردعمل میں پاکستان کے ادیبوں کی طرف سے بھی تنازعہ کشمیر پر پاکستانی نقطہ نظر کی حمایت میں ایک مشترکہ اعلان تیار کیا گیا۔ تاثیر صاحب نے اس بیان پر ترقی پسند ادیبوں کے دستخط حاصل کرنا چاہے مگر ''سوائے فیض صاحب کے سب ترقی پسند ادیبوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔''(۵) ڈاکٹر تاثیر کی اس جسارت پر ظہیر کاشمیری نے رسالہ ''سویرا'' کے اداریہ 'بات چیت' میں کچھ یوں غیض وغضب کا اظہار کیا کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے بارے میں پاکستانی اور بھارتی ترقی پسندوں کی نظریاتی ہم آہنگی کھل کر سامنے آ گئی۔ ظہیر کاشمیری کا استدلال پیشِ خدمت ہے:

''سب سے پہلے ڈاکٹر تاثیر نے ہمیں ایک خالص سیاسی میدان میں دعوتِ مبازرت دی، اس نے کشمیر کی جنگ کے بارے میں ہمارے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیج کر ہماری رائے طلب کی، ڈاکٹر تاثیر سمجھتا تھا کہ پاکستان کے ترقی پسند ادیب اس گشتی مراسلہ کے خلاف رائے دیں گے اور اس طرح ان کی تحریک رائے عامہ کی مخالفت کا شکار ہو کر خود بخود ختم ہو جائے گی......
ایک تو ہم مذکورہ مراسلہ کے پس منظر اور ڈاکٹر تاثیر کی نیت سے بخوبی واقف تھے اور دوسرے ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ ہم اسے آزاد کشمیر گورنمنٹ کا نمائندہ سمجھیں، اس لیے ہم نے مذکورہ مراسلہ کا جواب دینا مناسب ہی نہ سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر کے ترکش کا زہریلا تیر ہمارے سینوں میں پیوست ہونے کی بجائے فضا کی پنہائیوں میں کہیں کھو کر رہ گیا۔''(۶)

۲۸ مئی ۱۹۴۹ء کو مولانا عبدالمجید سالک کے نام اپنے خط میں لکھا کہ: ''ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں ہندوستان میں ہوں کہ پاکستان میں ہمارے ملک کے مفاد کے خلاف بیباک ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ہندی ترقی پسند تو کشمیر کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے رضاکار ہیں، کرشن چندر اور ڈاکٹر ملک راج آنند بھی۔ اور ہمارے ترقی پسند ابھی تک یہ بھی نہ کہیں کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔..... آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ غالباً ترقی پسندوں کے ممدوح ہیں۔ انھیں

اشترا کیوں سے الگ کیجیے اور راہِ راست پر لائیے۔ آپ یقین جانیے سب لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ اِن اشترا کیوں کی بے راہ روی کی بدولت ترقی پسندی کا کاروبار خراب ہو رہا ہے۔ ظلم و تشدد کو بہانے مل رہے ہیں۔ ادیبوں میں اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ غدار اور بد مذہب اشترا کیوں کو الگ کیجیے اور ترقی پسندوں کی ایک صالح جماعت بنائیے۔ .....بندہ تو ترقی پسندی اور اشترا کیت کو الگ الگ دیکھنا چاہتا ہے اور یہی آپ کی بھی آرزو ہے، تو پھر آپ کو حیرت کس بات پر ہے۔ اشترا کیوں کے نزدیک کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی حمایت بے ایمانی تھی۔ اُن کے نزدیک آج تک پاکستان ناقابلِ تسلیم ہے۔..... آپ مجھے کیوں لکھتے ہیں آپ خود ان اشترا کیوں سے ترقی پسندوں کو نجات دلائیے۔"(۷) انہی دنوں احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے طویل خط میں سہیل عظیم آبادی، ریوتی سرن شرما اور ساحر لدھیانوی کے مضامین کو درج ذیل استدلال کے ساتھ زیرِ بحث لائے ہیں:

> "پاکستان کے متعلق سہیل صاحب فرماتے ہیں: 'انگریزوں کی سازش سے ایک نام نہاد مسلم ریاست بن گئی۔' ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس منعقدہ کلکتہ میں کامریڈ بھوانی سین نے کہا اور سب نے مانا کہ 'برطانوی سامراج نے پاکستان بنوایا'۔ یہی نہیں بلکہ جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ پاکستان میں ایک نئی کمیونسٹ پارٹی بنائی جائے، تو بعض کامریڈوں نے کہا کہ 'اس طرح یہ سمجھا جائے گا کہ ہم نے پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کو سامراجی تقسیم تو تسلیم کرلیا'۔ اس کے جواب میں کامریڈ سجاد ظہیر جنرل سیکرٹری پاکستان اور کامریڈ رندیوے جنرل سیکرٹری ہندوستان نے بتایا کہ ہم اس تقسیم کو ہرگز تسلیم نہیں کر رہے، ہم تو ایک چال چل رہے ہیں تاکہ دونوں تحریکیں متحد کریں اور وہ لوگ جو دونوں تحریکوں کو الگ کرنا چاہتے ہیں، ان کے 'شور کو کم کریں' یعنی الگ نام رکھ کر دنیا کو آنکھ میں دھول جھونکیں۔..... جب نیتیں اور عزائم یہ ہوں تو پھر حکومت، ریاست، وطن، پاکستان کے الفاظ کو الگ الگ گنوا کر بحث کرنے کا مدعا کیا ہے؟..... جب آپ یہ کہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کو آپ تسلیم ہی نہیں کرتے تو پھر آپ کو کس ریاست، کس وطن، کس مملکت کے وفادار ہیں؟ جب آپ لیگ اور حکومت دونوں کے خلاف کھلی بغاوت کی تلقین کرتے ہیں، تو آپ کا یہ کہنا کہ 'کوئی ترقی پسند پاکستان کے اندر کوئی نیا ہنگامہ پیدا کرنا یا دیکھنا نہیں چاہتا' کیوں کر سچ سمجھا جائے!"(۸)

ڈاکٹر تاثیر پاکستان کے تصور، پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے قیام کو دُنیا کی تاریخ کا ایک عہد آفریں کارنامہ سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی روزنامہ پاکستان ٹائمز میں "پاکستان مبارک" کے عنوان سے ایک سلسلہء مضامین شائع کیا تھا جس میں طلوعِ پاکستان کی بشارت پاتے ہی زندگی کی تجدید اور نئی تعمیر کی منصوبہ بندی

شروع کر دی گئی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں ہی ''ماہِ نو'' کے خاص نمبر میں اُنھوں نے ''پاکستان میں کلچر کا مستقبل'' کے عنوان سے اصحابِ فکر و نظر کو پاکستان میں کلچر کے بربریت کی نذر ہو کر رہ جانے کے اندیشوں سے باخبر کیا ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر تاثیر نے شعر و ادب، رقص و موسیقی، ڈراما اور فلم، مصوری اور فلم سازی کے شعبوں میں جاری تخلیقی سرگرمیوں کے مُلّائیت کی وحشت و بربریت کے اندیشہ ہائے دور و دراز کی جانب متوجہ کیا تھا۔ اس بحث کے دوران اُنھوں نے ادیبوں اور فنکاروں کے سامنے درج ذیل سوالات بھی رکھے تھے:

''(۱) کیا آپ کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہے اور کیا آپ کو پاکستان کی آئندہ عظمت پر پورا بھروسہ ہے؟

(۲) آپ پاکستان کے لیے کس انداز کا جمہوری آئین پسند کرتے ہیں؟ ترکی، امریکہ، برطانیہ یا روس میں سے کہاں کا سا؟

(۳) آپ کے نزدیک آئین میں صوبوں کو زیادہ آزادی ہونی چاہیے یا مرکز کو زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔

(۴) کشمیر، حیدر آباد، ہندوستان، روس، اینگلو امریکی اور اسلامی ممالک کے متعلق پاکستان کی پالیسی کیا ہونی چاہیے؟

(۵) آپ کس چیز کے حامی ہیں...... سرمایہ داری، مکمل اشتراکیت یا برطانوی مزدور جماعت کی تدریجیت کے؟''(۹)

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پاکستان کے فنکاروں اور دانشوروں سے یہ سوالات بلاشبہ کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری سے الفاظ مستعار لیے جائیں تو ہمارے اشتراکی دانشوروں نے ان کا جواب دینا ہی مناسب نہ سمجھا۔ ڈاکٹر تاثیر اس نوعیت کے سوالات برسرِ اقتدار مسلم لیگی حکمرانوں سے بھی کرتے رہے اور اُس زمانے میں سرگرمِ عمل خلافت گروپ، 'شریعت کے تاجروں'، 'احرار'، 'خلافتِ پاکستان' اور 'اسلامی اشتراکیت کے نام لیواؤں سے بھی'۔ ڈاکٹر تاثیر کی صاحبزادی سلمیٰ محمود نے اپنی خودنوشت میں تاثیر صاحب کی زندگی کے اس آخری دور کی سرگرمیوں کو بڑا معنی خیز قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ اُن کے ابو یہ سمجھتے تھے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نظریہ سازوں کی تحریریں واقعتاً پاکستان کی جڑیں اُکھاڑ پھینکنے کی مساعی ہیں۔ سلمیٰ محمود لکھتی ہیں کہ:

"A significant phase in the last two years of Daddy's life was his conflict with the Progressive Writers Movement in Pakistan. He had genuinely come to believe that their concepts

were working against the very foundations of the fledgling state, regardless of any consequences. Apart from his articles written for The Civil and Military Gazette under the pen name of Dr. Hijazi, there were a series of 'flytings' published in the Nawa e Waqt and Maghrabi Pakistan."(11)

سلمیٰ محمود نے ثروت علی کے ساتھ انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر تاثیر کی پاکستانیت ہی کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے اُن کی دوری کا بنیادی سبب ٹھہرایا۔ سوال و جواب، ہر دو پیش خدمت ہیں:

"TNS: Many readers feel a little lost about Dr. Taseer's distancing from the Progressive Writers Movement? What were the specific reasons for his differences with the movement which he pioneered with other intellectuals?

SM: Regarding the Progressive Writers Movement, after Partition my father, along with several other intellectuals, genuinely believed that the Soviet-backed Marxist party of India was working against the integrity of Pakistan, and he received visitors from across the border who invited him to join in such anti-state activity which was repugnant to him."(12)

اسی زمانے میں ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کے درمیان طنزیہ و مزاحیہ منظومات کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر روز نامہ ''مغربی پاکستان'' میں مختلف قلمی ناموں سے منظومات شائع کرتے تھے جن کے جواب میں مولانا چراغ حسن حسرت روز نامہ ''تعمیر'' میں جوابی منظومات شائع کیا کرتے تھے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ نظریاتی جنگ بڑی حد تک منظوم گالم گلوچ بن کر رہ گئی تھی۔ آغا شورش کاشمیری نے ہفت روزہ ''چٹان'' (مورخہ ۱۲ دسمبر اور مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء) میں یہ تمام منظومات 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد' کے عنوان سے شائع کر دی تھیں۔ بعد ازاں محمد طفیل نے اپنے مجلّہ ''نقوش'' کے ضخیم 'ادبی معرکے نمبر' میں محفوظ کر دی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان منظومات میں سے دو چار اشعار

were working against the very foundations of the fledgling state, regardless of any consequences. Apart from his articles written for The Civil and Military Gazette under the pen name of Dr. Hijazi, there were a series of 'flytings' published in the Nawa e Waqt and Maghrabi Pakistan."(11)

سلمیٰ محمود نے ثروت علی کے ساتھ انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر تاثیر کی پاکستانیت ہی کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے اُن کی دوری کا بنیادی سبب ٹھہرایا۔ سوال و جواب، ہر دو پیش خدمت ہیں:

"TNS: Many readers feel a little lost about Dr. Taseer's distancing from the Progressive Writers Movement? What were the specific reasons for his differences with the movement which he pioneered with other intellectuals?

SM: Regarding the Progressive Writers Movement, after Partition my father, along with several other intellectuals, genuinely believed that the Soviet-backed Marxist party of India was working against the integrity of Pakistan, and he received visitors from across the border who invited him to join in such anti-state activity which was repugnant to him."(12)

اسی زمانے میں ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کے درمیان طنزیہ و مزاحیہ منظومات کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر روزنامہ ''مغربی پاکستان'' میں مختلف قلمی ناموں سے منظومات شائع کرتے تھے جن کے جواب میں مولانا چراغ حسن حسرت روزنامہ ''تعمیر'' میں جوابی منظومات شائع کیا کرتے تھے۔ تھوڑے عرصے بعد یہ نظریاتی جنگ بڑی حد تک منظوم گالم گلوچ بن کر رہ گئی تھی۔ آغا شورش کاشمیری نے ہفت روزہ ''چٹان'' (مورخہ ۱۲ دسمبر اور مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء) میں یہ تمام منظومات 'چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد' کے عنوان سے شائع کر دی تھیں۔ بعد ازاں محمد طفیل نے اپنے مجلّہ ''نقوش'' کے 'ضخیم ادبی معرکے نمبر' میں محفوظ کر دی تھیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان منظومات میں سے دو چار اشعار

قارئینِ کرام کی نذر کر دیے جائیں:

تاثیر: عجیب بات وہ جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لوہار کہتا ہے
میں چاند تارے کے قومی نشاں کا دشمن ہوں
یہ جاں نثار نہیں ، اُس کا یار کہتا ہے
تمہارے ملک کی تقسیم ہم مٹا دیں گے
وہ ایک بار نہیں ، بار بار کہتا ہے

....

حسرت: آج کل اُن کو یہ شکایت ہے
شعر فتو لوہار کہتا ہے
جنہیں قسمت نے دی ہیں جاگیریں
اُنھیں جاگیردار کہتا ہے
اہلِ جاگیر سے نہیں دبتا
ایک سُنتا ہے چار کہتا ہے

.....

شاعری آپ کی نہیں جاگیر
شعر فتو لوہار کیوں نہ کہے

.....

بدل کے نام وہ فتو لوہار پھر بولا
وظیفہ خوار میاں افتخار پھر بولا
سُنا ہے بندۂ زر سے اُلجھ پڑا فتو
حریفِ جُرۂ شہباز اِک ممولا ہے
زمانے بھر کی شرافت کو دیکھنے والے
کبھی قدرتی شرافت کو تُو نے تولا ہے
بُلند بانگ وہ دعوے وہ تیرا شور انا

خود اپنے ظرف کا پول آج تُو نے کھولا ہے

.....

تاثیر: وہ آ رہے ہیں میاں افتخار کے نوکر
رئیس شہر کے جاگیردار کے نوکر
وہ لال ہیں نہ وہ پیلے، وہ سرخ ہیں نہ سپید
وہ کچھ نہیں ہیں مگر افتخار کے نوکر
عجب طرح کا میاں افتخار سُرخا ہے
رئیس سُرخا ہے ، جاگیردار سُرخا ہے

.....

فتو کا خداوند ، اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
یہ رُوس کا فرزند اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
ہر ذہن میں جھلکتی ہیں نواہائے تخونوف
یہ نالۂ پابند اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

جب یہ قلمی جنگ نظریات کے بجائے ذاتیات کا رنگ اختیار کر گئی تو اس صورتِ حال پر دل برداشتہ ہو کر مولانا عبدالمجید سالک درمیان میں آ پڑے اور یوں منظومات کی یہ جنگ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ فریقین کے درمیان دوستی کی اس تجدید کا خوشگوار ترین نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر تاثیر نے سنجیدہ شاعری کی جانب مراجعت کی اور یوں ''یدِ بیضا'' کی سی عہد آفریں تخلیق وجود میں آئی۔ افسوس صد افسوس کہ اسی زمانے میں ڈاکٹر تاثیر نے صدائے اجل پر اچانک لبیک کہی اور ہم پاکستانیت کے علمبردار اس ترقی پسند شاعر اور دانشور سے محروم ہو کر رہ گئے۔

حواشی

۱۔ عبداللہ ملک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر محمد دین تاثیر سے سجاد ظہیر کی پہلی بار ملاقات ۱۹۳۵ء کے شروع میں کیمبرج یونیورسٹی میں ہوئی۔ کیمبرج میں مارکسی خیال کے ہندوستانی طلبہ کا ایک چھوٹا سا حلقہ تھا۔ اس زمانے میں مارکس کے ہم خیال لوگ ہندوستانی طلباء کی ایک تنظیم بنانا چاہتے تھے، چنانچہ سجاد ظہیر کو لنڈن سے کیمبرج میں ہم خیال طلباء سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا، جہاں سجاد ظہیر کی محمد دین تاثیر سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان دونوں کو افسوس ہوا کہ انھیں اس سے پہلے ملنے کا موقع کیوں نہیں ملا، حالانکہ وہ ایک سال سے انگلستان میں رہ رہے تھے۔ سجاد ظہیر، تاثیر صاحب کی ذہانت اور بذلہ سنجی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد دونوں باقاعدگی سے ملنے لگے،

چنانچہ لندن میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے اور اس کے مینی فیسٹو میں بھرپور حصہ لیا۔" (پرانی محفلیں یاد آ رہی ہیں، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۲۳۰)

۲۔ بیادِ صحبت نازک خیالاں، ڈاکٹر آفتاب احمد، کراچی، ۱۹۹۷، صفحہ ۷۷

۳۔ ایضاً، صفحہ ۷۸

۴۔ بحوالہ محمد حسن عسکری: مجموعہ محمد حسن عسکری، لاہور، ۲۰۰۰، صفحہ ۱۱۱۶

۵۔ ایضاً، صفحہ ۷۸

۶۔ بات چیت، ظہیر کاشمیری، ادب کی ترقی پسند تحریک کا ترجمان، رسالہ "سویرا" ۵، ۶۔ لاہور

۷۔ مقالات تاثیر، مرتب ممتاز اختر مرزا، لاہور، ۱۹۷۸، صفحات ۲۸۹۔۲۹۰

۸۔ ایضاً، صفحات ۳۰۹۔۳۱۰۔۳۱۱

۹۔ ماہنامہ ماہِ نو، خاص نمبر، کراچی، ۱۹۴۸ء

۱۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے Articles of M. D. Taseer، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

11- The Wings of Time, Salma Mahmud, New Delhi, 2012, Pp.141-142

12- The News, Islamabad, 25-3-2012

باب سوم

پاکستان مبارک!

اس تحریر کا عنوان ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے اُس سلسلہ مضامین کے عنوان سے مستعار ہے جو اُنھوں نے قیامِ پاکستان سے چند ماہ پیشتر روز نامہ 'پاکستان ٹائمز' میں لکھا تھا۔ میں آپ کو ڈاکٹر تاثیر کے اِن مضامین کے موضوعات و مطالب کی جانب بعد میں متوجہ کروں گا۔ پیشتر ازیں میں پاکستانی ادب کی کہانی انتظار حسین کی زبانی سناؤں گا۔ انتظار حسین نے اپنی یادوں کی کتاب ''چراغوں کا دھواں'' میں اُن نامور ادیبوں اور دانشوروں کو یاد کیا ہے جنھوں نے ''بڑے ٹھکانے سے اپنی ہجرت کی توجیہہ کی۔ بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے کس سرگرمی سے تحریکِ پاکستان کے جلسوں میں حصہ لیا، کس جوش وخروش سے نعرے لگائے تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ مل کر کس طرح تحریک کے لیے کام کیا تھا اور پھر جب پاکستان بن گیا تو اس نوزائیدہ مملکت کی خدمت کے جذبے نے کیسے اُنھیں اُکسایا اور وہ گھر بار چھوڑ کر کس حال میں یہاں پہنچے؟''(۱) ..... ان گھر بار چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنے والوں میں ڈاکٹر اسلم فرخی بھی تھے اور محمد حسن عسکری بھی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے عنبرین حسیب عنبر کے ساتھ اپنی ایک حالیہ گفتگو کے دوران بتایا ہے کہ اُنھوں نے تحریکِ پاکستان کو:

> ''ایک کارکن اور ایک مجاہد کی حیثیت سے دیکھا۔ کیوں کہ میں تو خود اس میں شریک تھا۔ تقریریں کرتا پھرتا تھا۔ مسلمانوں سے کہتا تھا کہ مسلم لیگ تمھاری جماعت ہے، تحریکِ پاکستان میں حصہ لو، پاکستان کو ووٹ دو۔ پھر الیکشن ہوا صوبائی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کا تو بڑا جوش و خروش تھا، سب میں۔ یو پی میں صوبائی اسمبلی میں غالباً دو امیدوار کانگریس کے کامیاب ہوئے تھے، باقی سب مسلم لیگ کے تھے اور جو مرکزی اسمبلی تھی اس میں تمام امیدوار مسلم لیگ کے کامیاب ہوئے تھے۔ وہ ایک غیر معمولی جوش وخروش تھا اور کسی کو کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ بس یہی تھا کہ پاکستان بن جائے گا تو مسلمانوں کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ پاکستان قائم ہونے کے فوراً بعد میں نے محسوس کیا کہ قصبے کا ماحول بدل گیا ہے اور وہ جو دوست تھے وہ عجیب طرح ملنے لگے

ہیں تو میں اُس زمانے میں بمبئی چلا گیا اور وہاں سے ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی آ گیا۔"(۲)

انتظار حسین نے تحریکِ پاکستان کے دوران میرٹھ میں پروفیسر کرار حسین کے ہاں محمد حسن عسکری سے اپنی ملاقات کی یادیوں تازہ کی ہے:

"ہمارے استاد پروفیسر کرار حسین کی بیٹھک۔ کیا خوب جگہ تھی۔ خاکسار تحریک سے جو نوجوان بغاوت کرتا وہ اچھرہ، لاہور سے بستر بوریا باندھتا اور یہاں آ کر ڈیرے ڈال دیتا۔ ادھر شہر کا ہر رنگ کا معزز چل کر یہاں آتا اور کرار صاحب کی گفتگو سے سیراب ہو کر جاتا۔ ہم جیسے طالب علموں کا بھی پھیرا لگتا رہتا۔ اب عسکری صاحب نے یہاں باقاعدہ روز شام کو آنا شروع کر دیا تھا۔ شروع میں میرا گمان یہ تھا کہ عسکری صاحب خالص ادب کے آدمی ہیں۔ مگر وہ تو ساتھ میں مسلم لیگی بھی نکلے۔ اور ایسے ویسے مسلم لیگی۔ بس مت پوچھو۔ کرار صاحب کے یہاں ابھی تک صرف خاکساری نقطۂ نظر سے یا رد خاکساری نقطۂ نظر سے ملت اسلامیہ کے حالات کے تجزیے ہوتے تھے۔ اب یہاں مسلم لیگ کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ اعلان پاکستان کے بعد کے دنوں میں جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں اور ہر مسلمان سراسیمہ نظر آتا تھا عسکری صاحب کو دُور کی سوجھی۔ تجویز پیش کی کہ میرٹھ میں ایک ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سیاسی جدوجہد کا باب بند ہو گیا۔ اب کلچرل سطح پر جدوجہد کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ کرار صاحب نے اس تجویز پر صاد کیا اور وہ جوانوں نے خاکسار تحریک سے ٹوٹ کر اسلامی انقلابی تحریک شروع کر رکھی تھی اس کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیجیے منصوبہ بندیاں شروع ہو گئیں۔"(۳)

محمد حسن عسکری مسلمانوں کی حیاتِ نو کے انہی منصوبوں پر گہرا غور و فکر کرتے کرتے برطانوی ہند سے پاکستان میں آ وارد ہوئے۔ چنانچہ یہ بالکل قدرتی امر ہے کہ:

"پاکستان میں آ کر عسکری صاحب نے اس قبیل کے ارمان خوب پورے کیے۔ لاہور پہنچ کر وہ صرف چند مہینے چپ بیٹھے۔ پھر ایسے رواں ہوئے کہ اللہ دے اور بندہ لے۔..... قصہ یوں تھا کہ عسکری صاحب نے پاکستان سے ادیبوں کی وفاداری کا سوال اُٹھایا تھا۔ عبداللہ ملک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا کہ وفاداری کس سے؟ ریاست سے یا حکومت سے؟ لیجیے بحث چل پڑی۔ بس اگلے ہی ہفتے ممتاز شیریں کا ایک مراسلہ موصول ہوا۔ پھر محمود ہاشمی کا اور ترقی پسندوں کے مراسلے تو آ ہی رہے تھے۔ میں خوش تھا پھر جب "ساقی" نکل آیا تو عسکری صاحب اپنی یہ بحث

وہاں لے گئے جو پاکستان سے وفاداری کے سوال سے پاکستانی ادب کے سوال پر گئی۔ پھر عسکری صاحب نے ایک اور زندگانی اور اسلامی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔"(۴)

اسلامی ادب کی اس بحث کو جماعتِ اسلامی سے وابستہ چند ادیبوں اور شاعروں نے بہت جلد اُلجھا کر رکھ دیا۔ عتیق احمد نے اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک اور کراچی" میں لکھا ہے کہ "جماعتِ اسلامی نے ترقی پسندوں کے پھیلائے ہوئے "الحاد فحاشی اور بے حیائی کے رجحانات" کا سدِ باب کرنے "اور اسلامی ادب اور اسلامی قدروں کے فروغ" کے لیے ایک ماہنامہ "مشیر" نکالا جو تین چار شماروں کے بعد اس جہاد سے فارغ البال ہو کر بند ہو گیا۔ اس کے بعد ایک ہفت روزہ کوثر اور روز نامہ "تسنیم" نئی آن بان اور نئے جذبہ جہاد سے سرشار میدان میں لائے گئے۔ مولانا نصر اللہ خان عزیز، مولانا نعیم صدیقی، آباد شاہ پوری، ارشاد حقانی اور مولانا کوثر نیازی ان دونوں جرائد کے قلم کاروں میں تھے۔ جماعتِ اسلامی کا یہ جہادی اسکواڈ ۵۲ء کی ترقی پسند کانفرنس تک خاصا فعال رہا۔ ...... ۱۲ جولائی ۵۲ء کی آل پاکستان ترقی پسند کانفرنس ختم ہوئی تو بالکل اچانک ۱۷ جولائی ۵۲ء کو حلقہء ادبِ اسلامی نے اسی طرز پر ایک اسلامی ادبی کانفرنس مولانا مودودی کی صدارت میں منعقد کر ڈالی۔ یہ کانفرنس وائی ایم سی اے ہال لاہور میں ہوئی۔ روز نامہ "تسنیم" میں اس کی روداد کئی دن تک قسط وار شائع ہوتی رہی۔"(۵)

اسلامی ادب کے تصور کو جماعتِ اسلامی ادب کے تصور میں مسخ کر کے جماعتِ اسلامی سے وابستہ ادیبوں نے اسلامی ادب کے نام لیواؤں کو بڑی حد تک چُپ کرا دیا۔ عسکری ہو یا منٹو، صمد شاہین ہو یا ممتاز شیریں ان کے "نیا دور" کے سے رسائل و جرائد میں لکھنے والے اختر حسین رائے پوری کے سے ادیب بھی اسلام کے بجائے پاکستان کے تصور اور پاکستان کی حقیقت کے حوالے سے نئے ادبی طرزِ احساس کے خدوخال واضح کرنے میں مصروف رہے۔ ایسے سب دانشوروں کو مارکسی ادیبوں نے سرکاری ملازمت کے متلاشی ادیب قرار دیا۔ ادیبوں کے ادیبوں پر اس طرح کے ناروا حملوں کا خیال کرتا ہوں تو مجھے اُن ادیبوں کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے جو اپنے نومولود وطن میں تعمیر و ترقی کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کوشاں تھے۔ یہ لوگ حُبِ وطن میں سرشار تھے اور ان کے نکتہ چین اپنے طعن و تشنیع پر نازاں۔ محمد حسن عسکری کے سے دانشور ان طعنوں سے بے پروا اپنی دھن میں پاکستان کا بول بالا کرنے میں مصروف تھے۔ عسکری صاحب نے مئی ۱۹۴۶ء میں "پاکستان" کے عنوان سے علمائے ہند کے پاکستان مخالف استدلال کی تردید کرتے وقت لکھا تھا:

"جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ اب کوئی خالص علمی مسئلہ تو رہا نہیں اور نہ کبھی تھا۔ یہ تو کروڑوں انسانوں کی موت اور حیات کا سوال ہے۔ جو چیز دس کروڑ انسانوں کا جائز مطالبہ ہو اور جس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو بھی تیار ہوں، وہ تو سمجھئے کہ مل ہی گئی..... آج نہیں تو ایک

دن دیر سے۔ پاکستان کا قیام تو اٹل ہے ہی۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ مسلمان ادیبوں کے لیے پاکستان کیسی نعمت ہوگی؟"(۶)

قیامِ پاکستان کے بعد ستمبر ۴۸ء میں عسکری صاحب نے اپنے مضمون "مسلمان ادیب اور مسلمان قوم" کو درج ذیل سطور پر تمام کیا ہے:

"مختصر یہ کہ پاکستان کو جہاں کوئلے اور لوہے کی کانوں کی ضرورت ہے وہاں اس سے بھی زیادہ ضرورت ایسے دماغوں کی ہے جو غیر جانبدار بھی ہوں اور قوم سے بے تعلق بھی نہ ہوں۔ اگر ہمارے یہاں ایسے دماغ پیدا ہو گئے یا موجودہ دماغوں میں ہی مناسب تبدیلیاں پیدا ہوگئیں تو پھر ہمیں لوہے کی کانیں نہ بھی ملیں تب بھی کوئی غم نہیں ہے۔ صالح دماغ فولاد سے زیادہ کام دیتا ہے۔"(۷)

محمد حسن عسکری اپنے مضمون "قراردادِ مقاصد اور پاکستان" اس مژدہ، جانفزا پر تمام کرتے ہیں کہ: "ہم نے انسان پرستی سے بچ کر ایک صالح زندگی کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم نہ رہ سکیں یا ان اصولوں کی تمام شرائط پوری نہ کر سکیں، بہر حال ہماری قومی زندگی کی حدیں تو مقرر ہوگئیں۔ اس کے بعد صالح زندگی کی تعمیر کا دارومدار ہماری ہمتوں اور ہمارے تخیل پر ہے۔"(۸) یہی زمانہ عسکری صاحب کے ہاں نئی پود کے ہونہار لکھنے والوں، انتظار حسین، ناصر کاظمی، سلیم احمد اور منیر نیازی وغیرھم کی مشفقانہ پذیرائی کا زمانہ ہے۔ اس نئی پود کے طرزِ فکر و احساس کی بہترین مثال منیر نیازی کی یہ تمنا ہے:

فروغ اسمِ محمد ﷺ ہو بستیوں میں منیر
پرانی یاد، نئے مسکنوں میں پیدا ہو

یہاں منیر نیازی گویا اقبال کی آرزومندی کی میراث سمیٹنے میں مصروف ہیں:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قیامِ پاکستان سے فقط چند ماہ بعد انتظار حسین نے "سیاسی بحران اور ہمارا ادب" کے عنوان سے قارئینِ ادب کو اپنے اس احساس میں شریک کیا تھا کہ "ادیب اس بحرانی دور کی تفسیر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اب ہم سیاسی طور پر ایک نئے دور میں قدم رکھ رہے ہیں۔ کیا یہ ناکامی اس بات کا تو اشارہ نہیں ہے کہ اُردو ادب میں ایک دور ختم ہو چکا ہے اور نیا دور شروع ہونے کے لیے کوئی موقع ٹٹول رہا ہے۔ ادب میں جب کوئی دور ختم ہونے کو ہوتا ہے تو تخلیقی قوتیں بالعموم بہت مضمحل ہو جاتی ہیں اور نئے دور کے شروع ہونے پر گزرے ہوئے دور کے ادیبوں کی قوتِ گویائی کچھ سلب سی ہو جاتی ہے۔

.... میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ادب میں جو نیا دور شروع ہونے والا ہے وہ اُن ادیبوں کے ہاتھوں شروع ہوگا جن کی ذہنیتیں ماقبل ۱۵ اگست عہد میں پختہ نہیں ہوئی تھیں۔ رہا اُن ادیبوں کا سوال جن کی ذہنیتیں اس گزرے ہوئے دور میں پختہ ہو چکی ہیں۔ سو انھیں یا تو اپنی ذہنیت میں لچک پیدا کرنی پڑے گی اگر وہ کر سکتے ہیں اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑے گا ورنہ پھر اُن سے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا جو ہر نئے عہد کے آغاز پر پرانے ادیبوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی انھیں رجعت پسند اور زندگی کی رو سے بیگانہ ادیبوں کی صف میں دھکیل دیا جائے گا۔"(۹) انتظار حسین نے تخلیقی قوتوں کے اضمحلال کے ثبوت اپنے اسی مضمون کے ابتدائی صفحات میں پیش کر دیے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ فسادات کا موضوع سکہ رائج الوقت بن چکا ہے مگر اس موضوع پر فقط صحافت نگاری عمل میں آ رہی ہے: "ادب مشاہدات کے اندراج کا نام نہیں ہے۔ یہ فرض تو صحافت نگار بہت خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ جب ادیب مشاہدات کے خالی اندراجات پر اُتر آتا ہے تو اُس کی تخلیق نہ ادب رہتی ہے نہ رپورٹ۔ لیکن بدقسمتی سے آج ادیب اسی کام پر اُتر آیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں خام اور ادھ کچری تخلیقات مل رہی ہیں۔"(۱۰) ترقی پسند اور جدیدیت پسند ادیبوں کے گروہ تو اپنی اُسی پرانی ڈگر پر گامزن رہے مگر انتظار حسین، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور متعدد دیگر نوجوان ادیب ایک نئے طرزِ فکر و احساس کے ساتھ پاکستان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کو درخشاں بنانے میں سرگرمِ عمل ہو گئے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نے رسالہ "ماہِ نو" (دسمبر ۱۹۴۸ء) میں اپنے مضمون "اُردو ادب تقسیم کے بعد" میں بصد مسرت یہ اعلان کیا کہ "پاکستان کی تحریک اور پاکستان کے قیام سے مسلمان عوام نے فی الحال اور چاہے کچھ نہ پایا ہو اتنا تو ضرور ہے کہ اُن کا قومی احساس ایک نئی کروٹ کے ساتھ جاگ اُٹھا ہے۔ ہماری نئی زندگی اور نئی تعمیر کا سب سے نمایاں پہلو یہی ہے..... قوم زندہ ہے ہمارے عوام اپنے اعتقادات و تصورات اپنی زندگی کے جملہ مظاہر اپنے طور طریقوں اور اپنے آداب و رسوم سے اس حقیقت کو ہمیشہ عملاً ثابت کرتے رہے کہ ہندی مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، اُن کا اپنا ایک کلچر ہے، اُن کی کچھ روایتیں ہیں جنھیں وہ اپنی متاعِ عزیز سمجھتے ہیں۔..... پاکستان کے قیام نے مسلمان ادیبوں میں پھر قومی احساس کو اُبھارا ہے وہ پھر اپنی قوم سے رشتہ جوڑنے لگے ہیں، اُس کا احترام کرنے لگے ہیں، اُنھیں اپنی تمدنی اور ثقافتی روایات کے تحفظ اور ترقی کی فکر ہونے لگی ہے۔ اصل میں تو خود پاکستان کا مطالبہ ہی اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ہم اس کلچر کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی بدولت پیدا ہوا کیونکہ ہمیں یہ خوف تھا کہ ہندوستان میں ایک معاندانہ ہندو اکثریت کا کلچر اسے برداشت نہیں کر سکے گا اور ہر حیلے بہانے اسے مٹانے کی کوشش کرے گا۔ ..... مختصر یہ کہ اس وقت پاکستانی اُردو ادب کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قومی تنقیدی تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو اس نئی سرزمین میں پرانوں کی یادیں تازہ کرا سکے اور جو نئے ادیبوں کو یہ کہتی ہوئی معلوم ہو کہ تمہارا آنا مبارک مگر ذرا مُڑ کر ایک نگاہ پیچھے ڈال لو۔ دیکھو کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں تمھیں اُن کی وراثت کا حقدار بننا ہے۔"(۱۱) ڈاکٹر آفتاب احمد نے

یہاں جس نئی ادبی تحریک کی تمنا کی ہے اُس میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر، سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، قدرت اللہ شہاب اور اُن کے ہمنوا بھی شریک تھے۔ اس تلاش و تجسس کو کبھی پاکستانی ادب کا نام دیا جاتا تھا تو کبھی اسلامی ادب کا۔ اِس تلاش و تجسس کی مذمت میں سرحد پار سے فراق گورکھپوری کے سے بہت سے ترقی پسند اور جدید ادیب بھی شریک تھے۔ چنانچہ آفتاب احمد نے ''بنامِ مُرشدِ نازک خیالاں!'' کے عنوان سے فراق صاحب کی خدمت میں چند مؤدبانہ گزارشات پیش کیں۔ اس پر رسالہ ''نقوش'' ہی میں دونوں کے درمیان مختصر سی مراسلت بھی شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے اپنے مضبوط استدلال کے ساتھ مسلمانوں کے ادب کے عہد بہ عہد ارتقا کی روشنی میں پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی تلاش کو وقت کا سب سے بڑا تقاضا قرار دیا تھا۔ ایسے میں پاکستانی ادب میں نئی پود نے اپنے نئے طرزِ احساس کو تخلیقی اور تنقیدی ہر دو سطحوں پر اُجاگر کرنا شروع کر دیا تھا۔ مضامین کے ساتھ ساتھ ''خوشبو کی ہجرت'' کے سے عنوانات کے تحت ادبی مکالمات کی وساطت سے بھی اس نئے طرزِ احساس کو متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔

یہ تو ہوئی نئی پود، اب آیئے پرانی پود کی جانب۔ طلوعِ پاکستان کے ساتھ ہی محمد حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو میں ادبی رفاقت گہری ہونے لگی تھی۔ جب تک عسکری صاحب لاہور میں مقیم رہے اس ادبی رفاقت کا ثمر بھی ادبی دنیا کو میسر آتا رہا۔ ''پاکستانی ادب'' کے عنوان سے عسکری صاحب نے بتایا ہے کہ:

> ''پچھلے سال منٹو صاحب نے متعدد کوششیں کیں کہ ترقی پسندی کے مروجہ تصور کو بدلا جائے اور ادیب اسلام کو اپنے تصورِ حیات کی اساس بنائیں اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر سماجی اور معاشی انصاف کا مطالبہ کریں۔ منٹو صاحب ادیبوں سے گھنٹوں اس بات پر جھگڑتے رہے ہیں کہ ہمارے لیے خالی انسانیت پرستی کافی نہیں ہے، ہمیں انسان کا وہ تصور قبول کرنا ہوگا جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ منٹو صاحب نعروں سے ایسا ڈرتے ہیں کہ اب ان کے ذہن میں خالی نعروں سے مطمئن ہو جانے کی صلاحیت بہت کم رہ گئی ہے، چنانچہ میں اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کی گرم جوشی لفظوں تک محدود نہیں تھی اس زمانے میں خلافتِ راشدہ کا تصور اس طرح ان کے دماغ پر مسلط تھا کہ وہ چاہتے تھے بس آج ہی پاکستان خلافتِ راشدہ کا نمونہ بن جائے اور سارے صاحبِ اقتدار لوگ حضرت عمر کی تقلید کرنے لگیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پاکستان محض رہنماؤں کی دانش مندی کے طفیل نہیں ملا ہے بلکہ پوری قوم کی متحدہ قوت اور عوام کے جذبۂ ایثار کی بدولت حاصل ہوا ہے۔'' (۱۲)

اِسی جذبۂ ایثار و محبت کے زیرِ اثر ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے 'پاکستان مبارک' کے عنوان سے ایک طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا تھا جو اُردو قالب میں ڈھل کر قیامِ پاکستان کے بعد کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اِس کتاب کا

پہلا مضمون ہے:''چند سیاسی وثقافتی مسائل''۔ مضمون کی پہلی چند سطروں میں ہی قارئین کو آزادی کی نوید کے ساتھ ساتھ زندگی کی نئی تشکیل وتعبیر کی جانب متوجہ کیا گیا ہے:

''ہم ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے۔ حصولِ پاکستان کے لیے جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن پاکستان کی جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔ ہمارے سامنے لاتعداد مسائل ہیں۔''(۱۳)

اس کتاب کے ۱۹ ابواب میں اِن مسائل کو زیرِ بحث لاکر بانیانِ پاکستان کے افکار کی روشنی میں ان کے حل تجویز کیے گئے ہیں۔ اِن مضامین میں اخوت ومساوات کے اصولوں کو اقتصادی منصوبہ بندی کی بنیاد بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اقتصادی ترقی کے موضوع پر اپنے مضمون کو یوں شروع کرتے ہیں:

''پاکستان سوشلزم کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ بےلگام سرمایہ داری کے تعیش کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا نظام ہے جو قرنوں سے جاری ہے، اس میں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتی ہے جب کہ بے شمار لوگ بیروزگاری اور نیم فاقہ کشی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بیکار فاضل پیداوار اور غیر منصفانہ تقسیم کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہ ایک فرسودہ نظام ہے جو اب زیادہ دیر کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ چنانچہ واضح طور پر جو راستہ ہے وہ ایک ایسا اقتصادی نظام ہے جس کا مقصود تمام ایسے صنعتی منصوبوں اور کاروباروں کو قومی ملکیت میں لینا ہونا چاہیے جو یا تو نئے ہوں یا زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوں۔''(۱۴)

اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر تاثیر نے زرعی اصلاحات سے لے کر اقلیتوں کے حقوق تک، تعلیم وتحقیق سے لے کر فنونِ لطیفہ تک اسلامی معیشت سے لے کر جنگ اور امن کے مسائل تک مختلف اور متنوع موضوعات پر بڑی زکاوتِ احساس اور دقتِ نظر کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ دیکھ کر دل کرب واضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہمیں آج تک اِن تصورات کو پاکستان کی تعمیر وترقی کی بنیاد بنانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ پاکستان میں ایک جہانِ نو کی تخلیق وتعمیر کے اِن خوابوں کی تحسین میں کامران اصدر علی نے درست لکھا ہے کہ:

"The historical certainty of the Marxists aside, it would be fair to argue that scholars such as Askari (despite his views on Manto's text) or Taseer-much like the new Pakistani state-were as eager to create a new world on the ashes of the old. Pakistan for them was a regenerative project

where a new 'Muslim' culture could prosper. Manto may have been marginal to such programmatic agendas, but Askari definitely sought to balance his attack on the progressives with his excitement of being given a fresh start in a place called Pakistan."(15)

ترقی پسند پاکستانیت کے علمبردار ادیبوں اور دانشوروں کی اس قوم پرستی کے خلاف انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ قلمکاروں نے جس جس انداز میں دادِ شجاعت دی ہے اُس کا بے لاگ تجزیہ سعدیہ طور نے اپنی کتاب The State of Islam میں کر رکھا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جرائد: سویرا، نقوش اور سنگِ میل میں بکھرے ہوئے مواد کا انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ تنقیدی تجزیہ کرنے کے بعد ڈاکٹر سعدیہ طور اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ وہ روشن خیال اور وسیع النظر دانشور جن پر سعادت حسن منٹو کے لفظوں میں انجمن نے حقہ پانی بند کر دیا تھا پاکستانی قوم پرست تھے۔ وہ قوم اور قومی ریاست، ہر دو سے اٹوٹ وابستگی رکھتے تھے۔ دوسری جانب وہ مارکسی نظریہ ساز تھے جو سوویت یونین کی اندھا دھند تقلید کے خوگر تھے:

"Despite the fact that the liberal anti-communist intellectuals continued to subscribe to many of the key values of "progressivism," the stand-off between them and the Progressives was fundamentally antagonistic in nature. The latter were vocal carriers of a hegemonic socialist and anti-imperialist tradition within the Urdu literary community which dominated the intellectual space within West Pakistan. The liberal writers thought of themselves, first and foremost, as patriots who were committed to putting their considerable energies and talents in the service of their new nation-state. Crucially, they defined this project of nation-building as being incompatible with the socialism and anti-imperialism of the Progressives, and strongly identified the nation with the state."(16)

یہ نظریاتی تصادم رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگا اور بالآخر ۱۹۵۲ء میں انجمن کی دوسری کُل پاکستان کانفرنس منعقدہ کراچی میں منظور کیے گئے نئے منشور میں بڑی حد تک ختم ہو کر رہ گیا اور یوں انجمن کے انتہا پسند طرزِ عمل کے نکتہ چین شورش کاشمیری تک نے انجمن کی کُل پاکستان کانفرنس میں پڑھے جانے کے لیے اپنا خیر سگالی کا پیغام ارسال کر دیا تھا۔ اس کے بعد بہت جلد شورش کاشمیری اور عبداللہ ملک کے درمیان مہر و محبت کا وہ دور لوٹ آیا تھا جس میں دونوں دوست مجلسِ احرار کے پُر جوش اور سرگرم کارکن رہے تھے۔ بعد ازاں عبداللہ ملک نے اُس دور میں شورش کاشمیری اور عبداللہ ملک کی باہمی خط و کتابت بھی کتابی صورت میں شائع کر دی تھی۔

◆◆◆◆◆◆◆

حواشی

۱۔ چراغوں کا دھواں، انتظار حسین، لاہور، ۱۹۹۹ء، صفحہ ۹
۲۔ رسالہ 'اسالیب'، کراچی، پروفیسر ڈاکٹر اسلم فرخی سے گفتگو، جنوری دسمبر ۲۰۱۳ء، صفحات ۳۹۶، ۳۹۷
۳۔ ایضاً، صفحات ۴۲۔ ۴۳، منٹو، عسکری، شیریں، ہتثلیث بمقابلہ ترقی پسند تحریک،
۴۔ ایضاً، صفحہ ۳۵، ۳۶، ۱۳ اور ۴۳۔
۵۔ ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر، مرتبین: پروفیسر قمر رئیس اور سید عاشور کاظمی، لاہور، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۳۲۶
۶۔ مجموعہ محسن حسن عسکری، لاہور، ۲۰۰۰ء، صفحات ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳
۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۱۹
۸۔ عسکری نامہ، محمد حسن عسکری، لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحہ ۲۸۹
۹۔ رسالہ نقوش (۲)، لاہور، صفحہ ۱۹
۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۶
۱۱۔ اشارات، ڈاکٹر آفتاب احمد، کراچی، ۱۹۹۶ء، صفحات ۱۰ سے ۱۸ تک۔
۱۲۔ عسکری نامہ، محمد حسن عسکری، لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحہ ۲۹۹
۱۳۔ پاکستان مبارک، محمد دین تاثیر، مرتبہ شیما مجید، لاہور، صفحہ ۲۵
۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۵۵
15- Surkh Salam, Kamran Asdar Ali, Oxford, Karachi, 2015, p.159
16- The State of Islam, Saadia Toor, New York, 2011, p.57

◆◆◆◆◆◆◆

باب چہارم

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان میں

پاکستان کا قیام قوموں کے حقِ خود اختیاری کے مسلّمہ اصول کی رُو سے برصغیر میں جداگانہ مسلم قومیت کی اساس پرعمل میں آیا تھا۔ اسلامیانِ ہند نے اپنی عوامی جمہوری تحریک کے زیرِ اثر الیکشن میں ووٹ کی پرچی کی قوت سے آل انڈیا کانگرس اور انڈین کمیونسٹ پارٹی کے متحدہ محاذ کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا۔ اس عبرتناک شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے کانگرس اور کمیونسٹ، ہر دو سیاسی پارٹیوں نے اپنی اپنی سازشوں سے پاکستان کو منا کر دوبارہ ہندوستان میں جذب کر دینے کی ٹھانی۔[۱] اُدھر ہندوستان میں پاکستان کی تباہی کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی اِدھر پاکستان میں طلوعِ آزادی کے جشن منائے جا رہے تھے۔ پاکستان کے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور صحافیوں نے ۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں اپنی پہلی کانفرنس میں پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں کوشاں ہو جانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ اس کانفرنس کی صدارت مولانا عبدالمجید سالک نے فرمائی تھی اور دوٹوک اعلان فرمایا تھا:

"رفیقو! میں مسلمان ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اقتصادی و معاشرتی مساوات کے لیے زندقہ و الحاد ضروری نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے خدا پرستی اور بلند ترین اخلاقی اقدار کی ضرورت ہے۔ اسلام ایک صحت مند سماج قائم کرنے میں دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مصیبت صرف یہ ہوئی کہ پہلے چند ہی سال گزر جانے کے بعد یہ دین سلاطین و امرا کے چنگل میں ایسا گرفتار رہا کہ اس کی وہ خوبیاں جو اس کے مقدس بانی کے پیشِ نظر تھیں، اب تک عملی دائرے میں پوری طرح اجاگر نہ ہو سکیں۔ حالانکہ مساواتِ جمہور اور کفالتِ جمہور اسلام کی معاشرت اور اقتصاد کے بنیادی پتھر تھے تاہم اس ملت کی ترکیب میں ایسی اہمیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی جمہوریت و مساوات کے بلند ترین تصورات کو بآسانی اختیار کر سکتی ہے۔ عزیزو! فضا تیار ہو چکی ہے۔ ملت صالح ہے اسباب مہیا ہیں، آپ حضرات قلم کے دھنی ہیں۔ اپنے موجودہ سکون و جمود کو ترک کیجیے اور معاشرے کو آئندہ انقلاب کی تیاری میں وہ امداد دیجیے جو ایک

آزاد و خودار قوم کے ادیبوں اور شاعروں کے شایانِ شان ہو۔''(۲)

تصورِ پاکستان کے عکس پر پاکستانی سیاست اور معاشرت کی تعمیرِ نو کا یہ عزم کمیونسٹ ادیبوں کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ انھوں نے انڈین کمیونسٹ پارٹی کی حکمتِ عملی کی پیروی میں قیامِ پاکستان کو ہماری قومی آزادی کے بجائے فرقہ وارانہ تقسیم قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت جاری رکھی۔ جب تک ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت مقرر کر کے پاکستان نہ بھیجی تھی تب تک لاہور کی کمیونسٹ پارٹی انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ہدایات کی پیروی ہی کی پابند تھی۔ چنانچہ رسالہ ''سویرا''(۳) میں ساحر لدھیانوی نے لکھا کہ:

''ہمارے وہ ادیب اور شاعر جو دونوں مملکتوں کو اقلیتوں کا قبرستان بنتے دیکھ کر گذشتہ چار مہینوں میں ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کی مشترکہ مساعی کا یہی ماحصل تھا؟ .... کیا انھوں نے اسی دن کے لیے جدوجہد کی تھی، کہ انھیں مذہب اور پیدائش کی بنا پر تقسیم کر دیا جائے۔ کیا ملک اور زمین کے ساتھ ادب اور تہذیب کی بھی فرقہ وارانہ تقسیم ہوگی.....؟ آج ہم سب کو اس سوال پر غور کرنا ہے، کیونکہ یہ سوال محض ادبی اور تہذیبی نہیں، اس پر ہمارے ملک اور ہماری قوم کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ ہم ادارہ سویرا کی طرف سے اپنے ان رفیقوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم ہر ممکن قربانی دے کر ادب اور تہذیب کے مشترکہ اثاثہ کی حفاظت کریں گے۔ سویرا ہمیشہ سے جمہوری ادب اور جمہوری تحریکات کا نقیب رہا ہے، سویرا آئندہ بھی انسانیت کے اس بلند اور ارفع نصب العین کی ترجمانی کرتا رہے گا جو جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کی تفریق سے بالاتر ہے۔ نئے دور اور نئے حالات میں سویرا اردو کے ترقی پسند مصنفین کو نئے عزم کے ساتھ اپنا تعاون پیش کرتا ہے۔ آیئے ہم سب مل کر ادب و تہذیب کی حفاظت کا حلف اٹھائیں اور دونوں مملکتوں میں جمہوری عناصر کو از سرِ نو تقویت بخشنے اور منظم کرنے کی جدوجہد شروع کریں۔''

اس جغرافیائی حدود سے بالاتر نصب العین کی ترجمانی کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کے ترجمان اسی جریدہ (سویرا۔ ۴) نے اپنے اگلے شمارہ کے اداریہ میں ''مذہب کے غلط نظریے'' کی مذمت میں اپنے استدلال کو یوں آگے بڑھایا تھا:

''جوں جوں نئے حکمران اپنے اصلی روپ میں عوام کے سامنے آتے جا رہے ہیں، پرانے طلسم ٹوٹ رہے ہیں۔ قومیت کے وہ محل چکنا چور ہو رہے ہیں جن کی بنیاد مذہب کے غلط نظریے پر رکھی گئی تھی۔ عوام اپنے اصلی دشمنوں کو پہچان رہے ہیں، اور دونوں مملکتوں میں اپنے

اپنے رجعتی حکمرانوں کے خلاف ایک بہتر اور توانا زندگی کے حصول کی جدوجہد شروع کر رہے ہیں۔ ہمارے ادیبوں اور فنکاروں کا فرض ہے کہ وہ عوامی مطالبات کا ساتھ دیں اور اس جدوجہد میں اُن کی رہنمائی کریں۔''

قیامِ پاکستان کو برصغیر میں اشتراکیت کے فروغ میں بہت بڑی رُکاوٹ قرار دینے والے ادیبوں نے ادیب اور ریاست سے وفاداری کا سوال اُٹھا کر خلطِ مبحث پیدا کرنے کی حکمتِ عملی اپنائی۔ عبداللہ ملک نے اپنے مضمون بعنوان ''ادیب اور ریاست سے وفاداری'' میں ادیب کو ریاست سے وفاداری کے موضوع پر غور وفکر سے بے نیازی کی روش پر گامزن رہنے کی تلقین کرتے ہوئے لکھا کہ:

''پچھلے کئی مہینوں سے اِس نیم براعظم کی دونوں نوزائیدہ مملکتوں کے حکمران طبقے اور اُن کے حالی موالی ادیب یہ سوال اُٹھا رہے ہیں کہ ادیب کو ریاست کا وفادار ہونا چاہیے یا نہیں؟ ..... ترقی پسند ادیب کو ریاست سے وفاداری کا مسئلہ پریشان نہیں کرتا۔ اس کا لائحہ عمل عوام سے وفاداری ہے۔ ترقی پسند ادیب اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے کیونکہ انھی عوام نے اسے جنم دیا ہے، اسے پالا ہے، پروان چڑھایا ہے اور انھی کی آسوں اور پیاسوں کا اظہار ان کے نغموں میں ہوتا ہے۔''(۳)

یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف عوام سے وفاداری کا یہ دعویٰ اور دوسری جانب عوام کی اجتماعی رائے سے وجود میں آنے والی مملکتِ پاکستان کی مخالفت میں 'دونوں ملکوں کے عوام' کی رٹ لگائے رکھنا اشتراکی ترقی پسندوں کا پسندیدہ چلن ہو کر رہ گیا تھا۔ عبداللہ ملک کا کہنا ہے کہ ادیب ریاست کا نہیں عوام کا وفادار ہوتا ہے۔ اگر ہم ایک لمحے کے لیے اُن کی اس منطق کو تسلیم کر لیں تب بھی اُن سے یہ سوال برمحل ہے کہ اگر آپ عوام کے وفادار ہیں تو پھر آپ لوگ عوام کی اجتماعی رائے سے وجود میں آنے والی ریاست کو مٹا ڈالنے کے درپے کیوں ہیں؟ آپ پنڈت نہرو اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی فرمانبرداری کا حق ادا کرنے کی خاطر عوامی جمہوری پاکستان کے ریاستی وجود کو پھر سے وسیع تر ہندوستان میں جذب کر دینے میں کیوں کوشاں ہیں؟.... اس زمانے میں رسالہ ''سویرا'' کے اوپر تلے دو تین شماروں میں اِس موضوع پر اسی استدلال کے ساتھ دادِ تحقیق دی گئی ہے۔ یہ صرف اسی ایک جریدے پر موقوف نہیں بلکہ ''نقوش'' (لاہور) سے لے کر ''سنگِ میل'' (پشاور) تک متعدد ترقی پسند ادبی جرائد قومیت کی نفی سے عالمگیریت کے اثبات میں مصروف ہو گئے تھے۔ اِس ضمن میں ساحر لدھیانوی کا مضمون ''ترقی پسند ادیب اور حب الوطنی'' عبداللہ ملک کے خیالات ہی کی جگالی کی ایک مثال ہے۔

عبداللہ ملک نے اپنے مضمون ''ہماری تحریک، ۱۵۔اگست ۴۷ء کے بعد'' میں ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گذشتہ پندرہ برس کی غلطیوں کو نہ دُہرانے کی ضرورت اور اہمیت اُجاگر کی۔ اُن کی تجزیاتی نگاہ میں ادیبوں کے

متحدہ محاذ کا خطرناک تصور انجمن کی سب سے بڑی غلطی چلی آ رہی ہے:

''ان پرانی غلطیوں کے تذکرے سے اکتایئے گا نہیں اس لیے کہ یہ غلطیاں ہمیں پندرہ برس کے طویل ورثے میں ملی ہیں اور آج تک یہ غلطیاں ہم میں موجود ہیں اور ہم پاکستان اور ہندوستان کے دونوں ملکوں میں اپنی تحریکوں کو آگے بڑھانے کا کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ ان غلطیوں کو ہم نہ سمجھیں گے اور دور نہیں کریں گے۔ چنانچہ متحدہ محاذ کا یہی غلط نظریہ تھا کہ جس نے پچھلے پندرہ برسوں میں شاندار اور عظیم ادب کی تخلیق میں رکاوٹ ڈالی۔ ہم کوئی گورکی پیدا نہ کر سکے۔ ہم صرف اقبال اور ٹیگور ہی کو سراہتے رہے اور یہ متحدہ محاذ اور سرمایہ داروں کے فلسفوں سے سمجھوتہ بازی ہی تھی جس کی وجہ سے ہم ایک نقاد بھی پیدا نہ کر سکے جو اقبال کے بارے میں بلا جھجک تنقید کر سکتا۔ ہم منٹو کے بارے میں ابھی چند دنوں تک ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے۔ ہم ممتاز مفتی کو نیا ادب کے معماروں میں شامل کرتے رہے۔ یہ تھا ہمارا ورثہ جس پر ماؤنٹ بیٹن پلان کا اطلاق ہوا اور ہندوستان پاکستان وجود میں آئے، اس ''آزادی'' پر دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے بازاروں کو خوب خوب سجایا، جلسے کیے گئے، جلوس نکالے گئے، ریڈیو اور پریس سے آزادی کے گیت گائے گئے۔ حتیٰ کہ حکمرانوں نے اپنے تمام ذرائع سے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ آزادی مل گئی۔ آزاد ہندوستان کے جے کارے بولو۔ مملکت خداداد پاکستان کے نعرے لگاؤ۔ اس موقع پر بھی ترقی پسند ادیبوں نے سرمایہ داروں اور سامراج کے سمجھوتے کو سمجھنے سے انکار کر دیا، انھوں نے تسلیم کر لیا کہ آزادی کی نعمت مقدسہ جواہر لال و لیاقت کی وساطت سے میسر آ گئی اور سرمایہ دار طبقے کی جیت کو اپنی جیت سمجھا گیا۔''(۴)

مزید برآں:

''متحدہ محاذ کی غلط سیاست کا منطقی نتیجہ یہی نکل سکتا تھا اور یہی نکلا کہ ہم نے اپنے اپنے ملکوں کے سرمایہ داروں اور جاگیردار حاکموں کی غداری کو اور سامراج سے سمجھوتہ بازی کو آزادی کا لقب دیا۔ ہم نے یہ سمجھنے سے انکار کر دیا کہ ماؤنٹ بیٹن پلان ہندو پاکستان کے بدلے ہوئے حالات میں یہاں کے عوام کو بدستور غلام بنائے رکھنے اور ان کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کا ایک نیا اور خطرناک حربہ ہے۔''(۵)

یہ سوویت یونین کی تقلید میں متحدہ اشتراکی ہندوستان کے قیام کی جدوجہد ہے جسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر سید سجاد ظہیر پاکستان میں روپوش تھے۔ فارغ بخاری نے اپنے مضمون بعنوان ''صوبہ سرحد میں ترقی پسند تحریک'' میں

اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسند "تنظیم کو کمیونسٹ پارٹی کا ادبی محاذ" سمجھا جاتا تھا اور یہ کہ "تقسیم ملک کے بعد سجاد ظہیر کی شہریت بھارت کی تھی لیکن وہ موجود پاکستان میں تھے۔"(۶) نومبر ۱۹۴۹ء میں جب لاہور میں ترقی پسند ادیبوں کا تین روزہ کُل پاکستان اجتماع منعقد ہوا اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا قیام عمل میں آیا تب رُوپوش سید سجاد ظہیر نے اپنے تہنیتی پیغام میں "ہمارے وطن پاکستان اور ہندوستان" کو اپنا مشترکہ وطن قرار دے کر اس تاثر کو مزید گہرا کر دیا تھا کہ اوّل: وہ پاکستان اور ہندوستان کی جغرافیائی وحدت پر یقین رکھتے ہیں اور دوم: اس پورے خطے کو اشتراکی نظام کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ حفیظ ملک نے اپنے مضمون "The Marxist Literary Movement" میں لکھا ہے کہ:

"In November 1949 the progressive writers held their first all-Pakistan Conference in Lahore. The Soviet Union sent to this Conference four delegates; two of them were Russians, and the other two were from Soviet Central Asia, bearing un-mistakable Muslim names. The Pavilion of the Conference was decorated with life-size pictures of Maxim Gorky, Vladimir Mayakovsky, Paul Robeson, and Howard Fast, Sajjad Zaheer's picture was displayed prominently but his absence from the Conference was necessitated by the warrant for his arrest issued by the Government of Pakistan."(7)

کنونشن میں بیرونی ادیبوں کا صرف ایک وفد شریک ہوا تھا۔ یہ وفد سوویت روس سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پنڈال صرف سوویت ادیبوں کی تصاویر سے سجایا گیا تھا۔ اس اہتمام سے اس قیاس کو تقویت ملی تھی کہ پاکستان میں قیام پانے والی یہ انجمن سوویت رائٹرز یونین ہی کی ایک شاخ ہے۔ حفیظ ملک نے اپنی اسی تحریر میں انجمن کے انتشار اور زوال کے اسباب پر درج ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"The fall of the progressive writers was precipitated by their bold challenge to the Pakistani establishment, and by their uncompromising stand against those writers who deviated from the official literary doctrine of the

Association."[8]

حفیظ ملک کا یہ تجزیہ حقیقت پرمبنی ہے۔اس کانفرنس میں جو منشور منظور کیا گیا تھا اُس میں اس حقیقت کا زیرِلب نہیں بلکہ بانگِ دہل اعلان کیا گیا تھا کہ ہمسایہ سوویت یونین کی حکومت اُن کی ہمنوا ہے۔اس منشور میں اس بات پر زورِقلم صرف کیا گیا تھا کہ:

''پاکستان میں رجعت پرست ادیبوں کے کئی گروہ پائے جاتے ہیں۔ایک گروہ ادب برائے ادب والوں کا ہے۔ادیبوں کا یہ گروہ اپنے عمل سے اپنے دعوے کی تردید کرتا ہے۔ آج پاکستان میں ادب برائے ادب کے سب پرچارک پاکستان کے حکمران طبقے کے تنخواہ دار ڈھنڈورچی ہیں اور اُس کی سماجی اور تہذیبی پالیسی کی تائید اسی شدت سے کرتے ہیں جس شدت سے دُوسرے رجعت پرست ادیب کرتے ہیں۔دوسرا گروہ اُن نام نہاد پاکستانی ادیبوں کا ہے جو اپنی تحریروں میں انتہائی گھناؤنی اور زہریلی قسم کی وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں...... تیسرا گروہ اُن ادیبوں کا ہے جو اسلامی ادب کے نام پر رجعت پرستی کا پرچار کرتے ہیں۔یہ انتہائی نقصان دہ تحریک ہے۔اس سے ہماری جمہوری تحریک اور حالات کو بہتر بنانے کی عوامی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ہم اس کے خلاف پوری مستعدی سے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ ..... یہاں اُن فحش نگار اور عریاں نویس ادیبوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو آج کل کے جنسی تعلقات اور جنسی اخلاق کو موجودہ سماجی پس منظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور محبت کے جذبے کی توہین اور تذلیل کرتے ہیں۔ .... ہمارا حکمران طبقہ اِن ادیبوں کو سراہتا ہے اور اِن کی رجعت پرست تحریروں کی ہمت افزائی کرتا ہے کیونکہ اس قسم کی تحریریں اِس طبقے کی سیاسی اور تہذیبی اقتدار کو برقرار رکھنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔''[۹]

اس منشور میں پاکستانی ادیبوں کے اِن تمام گروہوں کو ترقی پسند ادیبوں سے متصادم دکھایا گیا تھا جو قیامِ پاکستان کے پرجوش حامی تھے اور اس جوش وخروش میں پاکستانی ادب، اسلامی ادب اور نیا ادب کی تلاش وجستجو میں سرگرم تھے۔ادیبوں کے اِن تمام گروہوں کے ساتھ ترقی پسندوں کے اس تصادم کے پیشِ نظر ادیبوں کے اِن تمام گروہوں کے ادبی بائیکاٹ کی حکمتِ عملی اپنانے کا عہد کیا گیا تھا۔چنانچہ ترقی پسند جرائد میں اُن ادیبوں کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ رُکن نہ تھے۔

انجمن کی یہ حکمتِ عملی سٹالن کی قائم کردہ یونین آف سوویت رائٹرز کی اپریل ۱۹۳۲ء کی حکمتِ عملی کی پیروی کا شاخسانہ تھی۔اِس سرکاری ادبی پالیسی کی رُو سے سوشلسٹ حقیقت نگاری کی روحِ رواں سوشلزم اور کمیونزم کی تبلیغ واشاعت

ہے۔اس حکمتِ عملی کی رُو سے سوویت یونین کے نظام کے باب میں رجائیت کو ہر حال میں برقرار رکھنا ادیبوں کا فرضِ منصبی ہے۔اس لیے سوویت نظام کے کسی بھی متبادل نظام کا تذکرہ کاملاً ممنوع قرار پایا تھا۔اسی حکمتِ عملی کے تحت تفسیر و تعبیر کا ذرا سا اختلاف رکھنے والے ادیبوں کو رائٹرز یونین سے نکال دیا گیا تھا:

"As we shall see, in the context of the PWM, a similar exclusion happened in the case of Miraji, Manto, and Ismat on similar grounds. The Indian progressives, perhaps taking a cue from the Union of Soviet Writers, became increasingly intolerant of deviations and transgressions from the aims and objectives outlined in the PWA's Manifesto, which underwent several modifications, but remained the 'Bible', as it were, for the times.(10)

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ قیام سے پہلے موجود انجمن کی ذیلی تنظیمیں ہندوستان کی انجمن ہی کی پیروی میں مصروف تھیں۔ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین پر انڈین نیشنل کانگرس کے بائیں بازو اور انگلستان اور رُوس کی سیاست کی انتہائی گہری چھاپ تھی۔انجمن کی یہ شاخیں ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باضابطہ تشکیل سے پہلے اشتراکیت پسند دانشور عبداللہ ملک کی قیادت میں سرگرمِ کار تھیں۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ شاخیں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ہی کی حکمتِ عملی پر گامزن رہیں۔ان میں فعال اور متحرک کمیونسٹ دانشوروں کے اقوال و اعمال نے پاکستان کے مذہبی حلقوں میں شدید اشتعال پیدا کر دیا تھا۔اس اشتعال کی خطرناک ترین مثال یومِ بمبئی کے اجتماع میں آنحضور صلعم کی شان میں گستاخی کے ارتکاب کا الزام تھا۔اس سنگین صورتِ حال سے نبٹنے کی خاطر خود احمد ندیم قاسمی آگے بڑھے اور انھوں نے اخبارات کو اپنا ایک طویل بیان جاری کیا جس میں اپنی دینی شناخت اور تحریکِ پاکستان میں اپنی خدمات گنوا کر ثابت کیا کہ ترقی پسند ہونے کے لیے مُلحد یا بے دین ہونا ضروری نہیں:

انجمن ترقی پسند مصنفین ایک خالص ادبی ادارہ ہے اس کا ممبر بننے کی واحد شرط یہ ہے کہ انجمن کے منشور اور اغراض و مقاصد سے اتفاق ہو۔اس کے لیے کسی خاص سیاسی جماعت کا مؤید ہونا ضروری نہیں۔اگرچہ ترقی پسند سیاسی شعور لازمی ہے۔اس انجمن میں ہر سیاسی نقطۂ خیال کے فن کار موجود ہیں، کمیونسٹ بھی اور غیر کمیونسٹ بھی اور یہ سب فنکار ایک ہی ادبی پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہیں کہ انھیں اس انجمن کے منشور سے اتفاق ہے اور وہ ادب کو تنقیدِ حیات اور تطہیر

حیات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کا جنرل سیکرٹری ہوں اور عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو واحدہٗ لاشریک اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ والہ اصحابہ وسلم کو ختم المرسلین مانتا ہوں۔ اس کی گواہ میری تحریریں بھی ہیں اور میرا عمل بھی۔ میں نے پاکستان کو مسلمانوں کی ملی بقا کا واحد ذریعہ سمجھ کر اس کے حصول کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ قربانیاں دیں تحریر و تقریر اور نشریات کے ذریعے قیام پاکستان سے پہلے اس کے حصول اور حصول پاکستان کے بعد اس کے استحکام کا فریضہ ادا کیا۔ اطلاعاً یہ بھی عرض کر دوں کہ پشاور اور لاہور ریڈیو سے میرے اسلامی اور ملی ترانے ریکارڈ ہو کر باقاعدہ نشر ہو رہے ہیں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے میرا ملی ترانہ 'سدا اونچا ہے جھنڈا ہمارا' مسلسل براڈ کاسٹ ہو رہا ہے۔ ان سب حقائق کے باوجود میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہوں۔ محض اس لیے کہ اس انجمن کا منشور میرے مذہبی عقائد میں حائل نہیں ہوتا اور اس منشور کی کوئی شق غیر اسلامی نہیں۔ میرے علاوہ راسخ العقیدہ مسلمان ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس انجمن میں شریک ہے۔"(۱۱)

بلاشبہ احمد ندیم قاسمی کا یہ بیان حرف بہ حرف سچ ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اسی دور میں ہندوستانی کمیونسٹ سجاد ظہیر پاکستان میں روپوشی کے عالم میں پاکستانی کمیونسٹوں کو پاکستان اور ہندوستان کی وحدت کے گیت سنا رہے تھے۔ حمید اختر اُن کی خفیہ کمین گاہوں میں اُن کی رفاقت کا حق ادا کرنے میں مصروف تھے۔(۱۲) عبداللہ ملک کی رہنمائی میں کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند ادیب اوّل اوّل پاکستان کے جداگانہ اور منفرد قومی و جغرافیائی وجود کو نظریاتی طور پر قبول کرنے سے انکاری تھے۔ اشتراکی دانشوروں کی اس اندھادھند پیروی ہند کو سب سے پہلے ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے پہچانا اور برملا اعلان کیا کہ پاکستان میں ترقی پسند تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بھارت میں ہے۔(۱۳) اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے ادبی جریدہ "نقوش" میں 'تقاضے اور فرائض' کے عنوان سے ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالہ "سویرا" میں قیامِ پاکستان کے باب میں منفی خیالات کے اظہار پر تشویش کا اظہار کیا تھا:

"پاکستان کے ظہور میں آتے ہی چند گروہوں نے پاکستان کے خلاف محض اس لیے زہر اگلنا شروع کر دیا ہے کہ ان کی نظر میں یہ خالص اسلامی مملکت ہے اور اس ترقی یافتہ زمانے میں ملکوں کی تقسیم اور جغرافیائی حد بندی مذہب کے بجائے کلچر یا زبان کے مدنظر ہونا چاہیے، ان احباب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ تقسیم ہند کا مطالبہ دو بڑی قوموں کے ثقافتی اختلافات کی بنا پر کیا گیا تھا۔ ان دونوں قوموں کی ثقافت براہ راست ان کے مذہبی عقاید و روایات سے وابستہ تھی۔ اس لیے اسے مذہبی تقسیم کہا جانے لگا، دراصل یہ بے اطمینانی لفظوں کی بھول بھلیاں میں ایک جذباتی

الجھاؤ کے سوا اور کچھ نہیں اور تقسیم کے بنیادی اسباب پر بہت کم غور کیا گیا ہے۔ اگر چند لوگوں کی نظر میں ملک کی تقسیم کا خیال غیر فطری اور رجعت پسندانہ تھا تو تقسیم کے بعد الگ الگ خود مختار حکومتوں کے قائم ہونے کے باوجود ملک کی وحدت کی رٹ لگائے رکھنا، دونوں ملکوں کو گالیاں دینا، دونوں ملکوں سے دشمنی کے مترادف ہے۔''(۱۴)

عبداللہ ملک نے اس حقیقت کا اعتراف کر رکھا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کو پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سیکرٹری جنرل اس لیے چُنا گیا تھا کہ وہ ایک نیک نام اور باکردار ادبی شخصیت تھے۔ ایک ایسی نیک نام شخصیت جسے پاکستان کی مخصوص دینی فضا میں عوامی پذیرائی حاصل تھی۔(۱۵) کُل پاکستان کانفرنس ۱۱۔۱۲ اور ۱۳ نومبر ۴۹ء کو لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ اس کانفرنس کے محرکات وعوامل پر احمد ندیم قاسمی نے درج ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی تھی:

''ملک کے نئے تہذیبی، ادبی اور سیاسی اور سماجی مسائل کو ترقی پسند نقطۂ نظر سے پرکھنے اور ترقی پسند فنکاروں، دانشوروں اور صحافیوں کے لیے ایک توانا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے لاہور میں کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان کے عوام، جمہوری ادارے اور عوامی جماعتیں اور دیگر ترقی پسند عناصر پاکستان کے اس عظیم تاریخی اجتماع کو کامیاب بنانے میں انجمن کی کنوینگ کمیٹی اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ تعاون کریں گے اور کانفرنس کی سہ روزہ نشستوں میں بھرپور حصہ لے کر پاکستان کے علمی رتبے کو بلند کریں گے۔ یہ کانفرنس ایک نہایت اہم دور میں ایک نہایت کڑے موڑ پر رکی ہوئی قوم کے لیے ایک پیغامِ عمل ثابت ہوگی اور پاکستان میں فاشستی رجحانات کے خلاف ایک زبردست محاذ کھڑا کرے گی۔ وہ لوگ جنھیں انسان کی عظمت، انسانی زندگی کے تقدس، انسانی محنت کے کمالات، امن، حسن، جمہوریت اور تہذیب پر یقین ہے کانفرنس میں جوق در جوق شامل ہو کر پاکستان کے کلچری مرتبے اور بین الاقوامی اہمیت کو بڑھانے، نیز پاکستان کے مستقبل کو غاصب اور استحصالی قوتوں سے بچانے کے لیے اپنے ملک کی سب سے بڑی ادبی انجمن کا ہاتھ بٹائیں۔''(۱۶)

یہ تو رہیں اُمیدیں، اب آیئے اندیشوں کی جانب:

''قدامت پسندوں اور رجعت پرستوں کی طرف سے کوششیں ہو رہی ہیں کہ اول تو کانفرنس پر سرکاری طور پر پابندی عائد کرائی جائے (تاکہ ادب اور تہذیب پھلنے پھولنے کی مصیبت سے محفوظ رہیں) ورنہ ان رجسٹرڈ قسم کے وطن پرستوں کے پاس ایک اور ہتھیار بھی ہے اور

وہ ہے تکفیر بازی۔ یہ سلسلہ تو شروع بھی ہو چکا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے مذہب کو غلط رنگ دے کر قوم سے سوچ بچار اور عمل کی تمام قوتیں چھین رکھی ہیں احیائی میلانات کی مخالفت میں اپنی موت دیکھنے لگے ہیں اور احیا اور تجدید کو من مانے معنی پہنا کر عوام کو ورغلانے کی فکر میں ہیں۔ ایک گروہ نے غنڈہ گردی کا پروگرام بھی سوچ رکھا ہے لیکن ترقی پسند مصنفین کے پاس زندگی اور ارتقا کی قوتیں ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ وہ جنھوں نے قوم کو بار بار ماضی کے تیرگی کدوں میں واپس گھسیٹ لے جانا چاہا آج مستقبل کی طرف بڑھتے ہوئے کاروانوں کے دامن گیر تو ضرور ہوں گے مگر ان کا انجام واضح ہے۔ خود ان پر بھی واضح ہے اسی لیے تو بوکھلاہٹ نے ان سے تدبر و فکر کی تمام قوتیں سلب کر رکھی ہیں۔ ترقی پسندوں کو ان مخالف عناصر سے قطعی بے پروا رہنا چاہیے کیونکہ ڈوبتے ہوئے سورج کا شعلہ محض رنگ ہے اور اس سوز سے محروم ہے جو صرف ابھرتے ہوئے سورج سے وابستہ ہوتا ہے۔"(۱۷)

یہ ہیں وہ اندیشہ ہائے دور و دراز جن کے پیشِ نظر احمد ندیم قاسمی کے سے روشن خیال مسلمان، انسان دوست اور قوم پرست ادیب کو، بہ امرِ مجبوری، انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا تھا۔ انجمن کی قیادت سنبھالنے کے فوراً بعد احمد ندیم قاسمی کو سید سجاد ظہیر، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے لے کر عابد حسن منٹو اور عارف عبدالمتین تک کی نظریاتی تبلیغ و تلقین کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ الگ بات کہ احمد ندیم قاسمی ان لوگوں کے "سائنسی" استدلال کو اپنے روحانی اور وجدانی استدلال سے ہمیشہ رد کرتے چلے آئے تھے۔ ہر چند دہریت اور مادی ہمہ اُوست کی حد تک تو ان اشترا کی مبلغین کا استدلال قطعی طور پر بے اثر رہا تاہم مصورِ پاکستان اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال کی مجنونانہ مذمت اور انجمن سے باہر ادیبوں اور شاعروں کے بائیکاٹ کی پالیسی کی حمایت میں ندیم صاحب، عبداللہ ملک اور دیگر اشتراکیت پسند اراکینِ انجمن کے ہمنوا بن گئے تھے۔

ترقی پسند نظریہ سازوں کی جانب سے علامہ اقبال کی مذمت کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ پاکستان کا جغرافیائی وجود اقبال کی اسلامی انقلابی شاعری سے پھوٹا ہے۔ پاکستان کے وجود کو قائم و دائم رکھنے اور یوں ایک مُلّائیت دشمن جدید مثالی اسلامی مملکت اقبال کے انقلابی تصورات کو حقیقت کا پیکر بخش کر ہی تشکیل دی جا سکتی ہے۔ یہ عزم و عمل برصغیر میں اشتراکیت کے تسلط کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور سید سجاد ظہیر سے لے کر سید سبطِ حسن، ممتاز حسین، عبداللہ ملک اور اُن کے ہمسفر برصغیر میں کمیونزم کے فروغ میں اِس زبردست رُکاوٹ کو دُور کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ بدنصیبی سے احمد ندیم قاسمی بھی، تھوڑے عرصے کے لیے ہی سہی، اِس گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے "ترقی پسند مصنفین اور معترضین" کے عنوان سے تنظیم کی حکمتِ عملی پر اُٹھائے جانے والے سوالات کے

جواب میں یہ سوال اُٹھانا ضروری سمجھا کہ:

''کیا اقبال کا کلام کتابِ پاک ہے؟..... اقبال کا مردِ مومن کا تصور پتھر پر لکیر نہیں بن گیا کہ پاکستان کے لیے ایک نیم فسطائی نظامِ حکومت کا جواز پیدا کیا جائے!''(۱۸)

درج بالا سوال اور جواب سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی قیادت اقبال کی مقبولیت سے خائف تھی۔ یہ لوگ پاکستان میں اقبال کے انقلابی تصورات کے رُوبعمل آنے کے امکانات معدوم کر دینا چاہتے تھے۔ خود فیض احمد فیض نے ڈاکٹر ایوب مرزا کے ایک سوال کے جواب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اقبال دشمنی کے باعث:

''اس تحریک کو دھکا لگا، وہ ہمارے چند انتہا پسند دوستوں کی وجہ سے۔ بھئی ۱۹۴۹ء میں احمد ندیم قاسمی جنھوں نے Realistic ادب کی تخلیق کرنے میں خاصا نام پیدا کر لیا تھا انجمن کے سیکرٹری تھے۔ حکم ہوا کہ علامہ اقبال کو Demolish کریں اور عصمت چغتائی، منٹو اور ن م راشد کو Exterminate کریں کہ یہ ترقی پسندوں کی کسوٹی پر پورے نہیں اُترتے۔ ہمیں یہ بک بک لگی۔ علامہ مرحوم کے ہاں بے پناہ ذخیرہ سامراج، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ملتا ہے۔ یہی قصہ منٹو وغیرہ کے بارے میں تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ہماری ان سے جنگ ہوگئی۔ ہمارا موقف تھا کہ کسی بھی شاعر یا ادیب کی تخلیق کو اس کی Totality اور عصری تقاضوں کے Perspective میں پرکھا جاتا ہے۔ اس کے کسی ادب پارے کے ایک ٹکڑے سے اس کی Contribution کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا جائزہ حقائق کے خلاف ہوگا اور باطنی طور پر ضعیف بھی۔..... پھر ایک روز مظہر علی خاں کے گیراج میں انجمن کی میٹنگ ہوئی۔ صفدر میر صدر تھے۔ قاسمی صاحب نے علامہ اقبال کے خلاف ایک بھرپور مقالہ پڑھا۔ ہمیں بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ ہم نے اعتراض کیا کہ یہ کیا تماشہ ہے؟ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ تو سکہ بند قسم کی بے معنی انتہا پسندی ہے۔ ہماری نہ مانی گئی۔ ہم بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اس کے بعد ہم انجمن کی محفلوں میں شریک نہیں ہوئے اور صرف پاکستان ٹائمز چلاتے رہے۔''(۱۹)

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ وہی احمد ندیم قاسمی ہیں جنھوں نے اپنے مجموعہ کلام 'جلال و جمال' کے آغاز میں ''میرا فنی نظریہ'' کے عنوان سے اقبال کی 'حکیمانہ شاعری' کے رنگ میں شاعری کرنے کو اپنی 'عزیز ترین تمنا' قرار دیا تھا مگر آج وہ اپنے اشتراکی نظریہ ساز ساتھیوں کے طلسم میں اسیری پر نازاں نظر آتے ہیں۔(۲۰) ہر چند فیض احمد فیض اقبال شکنی اور اختلاف نظر رکھنے والے ادیبوں سے قطع تعلق کے مخالف تھے تاہم انجمن ترقی پسند مصنفین ہر دو پالیسیوں پر عمل پیرا رہی۔

علامہ اقبال کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود برصغیر کو اشتراکیت کی گرفت میں دیکھنے کے تمنائی علامہ اقبال کو اپنے اس عقیدہ و عمل کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ سمجھتے تھے۔ مدتوں پہلے اقبال نے بڑے یقین کے ساتھ یہ نوید دی تھی کہ:

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

....

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سُوئے کُوفہ و بغداد

پاکستان اس جہانِ نو کے امکانات کا ظہور تھا۔ یہ اہلِ نظر کی بسائی ہوئی تازہ بستی کے وہ امکانات تھے جو ملوکیت اور مُلّائیت سے آزاد حقیقی، انقلابی اسلام میں پوشیدہ ہے۔ ان امکانات کو زندگی کے ٹھوس حقائق میں بدلنے کا وقت آیا تو فرنگی جواریوں کے قائم کردہ جواخانے میں بیٹھی ہوئی اشرافیہ میں دوایک انڈین کمیونسٹ بھی آ شامل ہوئے۔ انھیں اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر اقبال کا انہدام ضروری معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان کے وہ ادیب، شاعر اور دانشور بھی معتوب ٹھہرے جو پاکستان کے قیام کو ایک جہانِ نو کی بشارت سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر، اختر حسین رائے پوری، محمد حسن عسکری، سعادت حسن منٹو، ممتاز شیریں، صمد شاہین اور ان کے حلقہ ہائے اثر پر انجمن کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ترقی پسند ادبی جرائد میں ان کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ان کی تخلیقات کی مذمت میں قلمی مہم شروع کر دی گئی۔ ان سب معتوب ادبی شخصیات اور میلانات کی قدرِ مشترک پاکستانی قوم پرستی کی ترویج و اشاعت ہے۔

۱۲ جولائی ۱۹۵۲ء کی شام کُل پاکستان ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کانفرنس کے عام اجلاس میں پروفیسر ممتاز حسین نے انقطاع کی تنسیخ کی تجویز پیش کرتے ہوئے سامعین کو یقین دلایا کہ:

> ''ہم میں سے کچھ ادیب اشتراکی نقطۂ نظر کے حامی ضرور تھے، لیکن زیادہ تر ادیب ایسے بھی تھے، جنھیں اس سے اتفاق نہیں تھا...... انجمن ایک ادبی جماعت ہے اس کا بنیادی کام ادبی تخلیق ہے۔ ادب کی صحیح پرکھ ہے اور اس کے لیے ہمارے پیش نظر تنقیدی شعور کو آگے بڑھانے کا واضح اصول موجود ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں تھا کہ ہم سے سیاسی گروہ بندی میں الجھتے۔ ہمیں یہ کہنے میں بھی جھجک نہیں کہ ہم نے اپنے ملک، وطن، تمدن اور کلچر کا صحیح مطالعہ نہیں کیا اور اسی لیے ہم سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ غلطیوں کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ہم عوام سے کٹتے جا رہے ہیں، چنانچہ ہم نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے بجائے ان کا جرات مندی کے ساتھ اعتراف کیا جس کے

ثبوت میں ہم اپنا منشور آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔''(۲۱)

انجمن کے نئے منشور نے انجمن کے شورش کاشمیری کے سے دشمن کو بھی اپنا دوست بنالیا جس کا سب سے بڑا ثبوت شورش کاشمیری کا انجمن کی اس دوسری کُل پاکستان کانفرنس کے نام درج ذیل پیغام ہے:

''میں آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے لیے دُعا کرتا ہوں۔ آپ کے جدید منشور کی روشنی میں ترقی پسند مصنّفین ہی ایک ایسی جماعت ہے جس سے ملک اور قوم کا ادبی مستقبل وابستہ ہے۔ میں ترقی پسند مصنّفین کو صرف اس لیے قابلِ تکریم سمجھتا ہوں کہ انھوں نے عوام میں نظام سرمایہ داری سے آنکھیں ملانے کی جرأت پیدا کی ہے اور نئی پود کو لہُو سے لکھنا سکھایا ہے۔ مجھے ادبی اقدار میں اگر کسی سے اختلاف رہا ہے تو وہ محض نعرہ بازی ہے۔ آپ کا جدید منشور اس کی نفی کرتا ہے۔ آپ یقین کیجئے آئندہ سے میرا قلم آپ کی معاونت میں خوشی محسوس کرے گا۔''(۲۲)

اور تو اور ترقی پسند ادب کے ترجمان رسالہ ''سویرا'' تک اسے بڑی اہم پیش رفت قرار دینے پر مجبور ہو گئے:

''انجمن ترقی پسند مصنّفین کی دوسری کُل پاکستان کانفرنس (جو ۱۲ اور ۱۳ جولائی کو کراچی میں منعقد ہوئی) میں انجمن نے اپنے ۱۹۴۹ء کے انتہا پسندانہ منشور کو منسوخ کر کے ایک نیا منشور منظور کیا ہے تاکہ پاکستان کے مختلف الخیال ادیبوں کا تعاون حاصل کر کے اردو ادب کے معیار کو بلند کرنے کی وسیع پیمانے پر کوشش کی جائے۔ اپنے نئے منشور میں انجمن نے بڑے واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ ایک ادبی انجمن ہے، اُس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور اُس کا بنیادی کام تخلیقِ ادب ہے..... انجمن کے ۱۹۴۹ء کے منشور میں بعض ایسے پہلو تھے جن کی بنا پر انجمن ادبی حدود سے تجاوز کر گئی اور حکومت نے اُسے سیاسی جماعت قرار دے دیا تھا اب جبکہ انجمن نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بعد ایک نیا منشور اپنایا ہے حکومت کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین پر سے سیاسی جماعت کا لیبل ہٹا لے کیونکہ انجمن ترقی پسند مصنّفین ہمارے ملک کی سب سے مقبول ادبی انجمن ہے جس کی ادبی خدمات کا اعتراف بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور مولانا عبدالمجید سالک جیسے برگزیدہ ادیبوں نے بھی کیا ہے۔''(۲۳)

ہر چند ہر مکتبِ فکر کے ادیبوں نے انجمن کے نئے منشور کا خیر مقدم کیا تاہم حکومت وقت نے انجمن پر سے سیاسی جماعت کا لیبل نہ ہٹایا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے'' کے مصداق اب پاکستان کے سیاسی اور تہذیبی آفاق پر میکارتھی ازم کے تاریک سائے چھانے لگے تھے۔

حواشی

۱- Leonard Mosley- نے اپنی کتاب The Last Days of the British Raj میں لکھا ہے کہ پنڈت نہرو نے اُس کے ساتھ اپنی گفتگو کے دوران اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ ایک عارضی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا تھا اور انڈین نیشنل کانگرس کو یقین تھا کہ پاکستان پھر سے جلد بھارت میں آ شامل ہوگا:

"But we accepted. We expected that partition would be temporary, that Pakistan was bound to come back to us." London 1961, p.23.

۲- رسالہ سویرا ۳، لاہور، صفحہ۲۸۔ پاکستانی فنکاروں کے اس پہلے اجتماع کی مزید تفصیل درج ذیل ہے:

''۵ اور ۶ دسمبر (۱۹۴۷) کو وائی ایم سی اے ہال لاہور میں پاکستان کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور فنکاروں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، پطرس بخاری، فیض احمد فیض، ڈاکٹر تاثیر، باری علیگ، حفیظ ہوشیار پوری، صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، فلک پیا، پروفیسر سرور جامعی، شیر محمد اختر، ناہید عالم، شورش کاشمیری، مسعود پرویز، ظہیر کاشمیری، عبدالمجید بھٹی، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری، اعجاز بٹالوی، قتیل شفائی، احمد راہی، اصغر سلیم، نور بجنوری، طفیل احمد، بلقیس طفیل، عبدالمتین عارف، صلاح الدین اکبر، سراج الحق حافظ اور ساحر لدھیانوی نے حصہ لیا۔

کانفرنس میں پاکستان کے فنکاروں کے لیے لائحہ عمل وضع کیا گیا اور بہت سی اہم تجاویز پیش کی گئیں جن میں سے خاص خاص تجاویز یہ ہیں:

۱۔ امن، آزادی، جمہوریت اور اقلیتوں کا تحفظ

۲۔ انڈین یونین کے ادیبوں کو پیامِ تہنیت

۳۔ اردو کو پاکستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت

۴۔ تہذیبی اور تعلیمی مہم

۵۔ پناہ گزینوں کا مسئلہ اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کی فوری ضرورت

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان کے ادیبوں کی آئندہ کانفرنسیں لائلپور، پشاور، راولپنڈی، سیالکوٹ اور کراچی میں منعقد ہورہی ہیں۔''.....

سویرا ۳، صفحہ۲۳۹

۳- عبداللہ ملک، سویرا ۳، صفحہ۱۹۲-۱۹۳

۴- رسالہ 'نقوش'، آزادی نمبر ۱۹۴۹ء، لاہور، صفحہ۲۲۳

۵- ایضاً، صفحہ۲۲۴

۶- ترقی پسند ادب- پچاس سالہ سفر، ترتیب: پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، لاہور، ۱۹۹۴ء، صفحہ۲۱۷

7- Journal of Asian Studies, 26(1967), p.661

8- Ibid.

۹- رسالہ سویرا ۷، ۸، لاہور، صفحات ۲۶، ۲۷، ۲۸

باب پنجم

نیا منشور اور میکارتھی ازم

یہ ہمارا بہت بڑا تہذیبی المیہ ہے کہ جس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے انتہا پسندی اور بائیکاٹ کی سوویت یونین سے مستعار حکمتِ عملی کو ترک کر کے اعتدال پسندی اور نظریاتی رواداری کی حکمتِ عملی اپنائی اُس زمانے میں ہماری حکومت ہر حال میں امریکی خوشنودی کے حصول میں کوشاں تھی۔ جمیل الدین عالی نے لکھا ہے کہ" پاکستان میں امریکی میکارتھی ازم آنے کے بعد تو اس کے جو عذاب ناک اثرات پاکستان پر خود امریکہ نواز پاکستانی حکومتوں کے ہاتھوں پڑے وہ تھانوں اور جیلوں کی اذیت دہی کی غیر شائع شدہ دردناک داستانوں کے علاوہ ہزاروں کھلی خبروں کی صورت میں بھی ریکارڈ پر ہیں۔ راست صحافت تو روز مجروح ہوتی تھی۔ گرفتاریاں، پابندیاں، بن لکھا سنسر، کبھی کبھی (۱۹۵۳ء) کھلا صوبائی سنسر بھی۔ بغداد پیکٹ (متوفی ۱۹۵۹ء) اور سیٹو معاہدوں کے تحت تو پاکستان واضح طور پر اینٹی کمیونسٹ (ادب میں ترقی پسند افکار کے خلاف) تادیبی اور تعزیری کارروائیوں کا پابند کر دیا گیا۔"[1] پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقدر کو سمجھنے کی خاطر لازم ہے کہ ہم سرد جنگ میں امریکہ کا اتحادی بن کر رہ جانے کے اثرات و نتائج پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیں۔

میکارتھی ازم کے خوفناک سائے

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ،لیاقت علی خان ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے جلسہء عام میں شہید کر دیے گئے تھے۔ کرائے کے قاتل کی اس گولی نے لیاقت علی خان کے ساتھ ساتھ پاکستان کی آزادی اور خود مختاری کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ شہید ملت کے بعد برطانوی تربیت یافتہ افسر شاہی کے چند اراکین: سکندر مرزا، غلام محمد، چوہدری محمد علی اور جنرل محمد ایوب خان سیاہ و سفید کے مالک بن کر رہ گئے تھے۔ یہ چاروں کے چاروں افسران رُوس اور امریکہ کے درمیان برپا سرد جنگ میں امریکی اتحادی بننے کے آرزو مند تھے۔ شہیدِ ملت نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران اِس حقیقت کا بار بار برملا اعلان کیا تھا کہ اشتراکی دنیا اور سرمایہ پرست دنیا کے مابین جاری سیاسی کشمکش میں پاکستان ان دو میں سے کسی ایک

10- A Literary History of the Progressive Writers Movement in India, Rakhshanda Jalil, Oxford, 2014, p.202:

۱۱۔ رسالہ نقوش (۲)، لاہور

۱۲۔ حمید اختر: آشنائیاں کیا کیا، احوال واقعی۔ احمد سلیم: حمید اختر، لاہور، ۲۰۱۰ء

13- Articles of Dr. M. D. Taseer, Islamabd, 2009, p.195

۱۴۔ رسالہ نقوش، ۳، لاہور

۱۵۔ قاسمی صاحب! تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، عبداللہ ملک، روزنامہ اوصاف، اسلام آباد بابت ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء

۱۶۔ ماہنامہ نقوش (۱۰)، لاہور، صفحہ ۴

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۴

۱۸۔ ماہنامہ نقوش (۹)، لاہور، صفحہ ۵

۱۹۔ ہم کہ ٹھہرے اجنبی، ڈاکٹر ایوب مرزا، لاہور، ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۳۷۔۱۳۸۔۱۳۹

۲۰۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ضمیمہ: اقبال کے خلاف چارج شیٹ

۲۱۔ میری دُنیا، رفیق چودھری، کراچی، ۱۹۸۷ء، صفحات ۹۹۔۱۰۰

۲۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۹

۲۳۔ بات چیت، سویرا۔ ۱۲، صفحہ ۵

فریق کا بھی پیروکار نہیں ہے۔ پاکستان نہ اشترا کی ہے اور نہ سرمایہ پرست۔ اس کا اپنا ایک تیسرا مسلک ہے۔ یہ مسلک ہے، اسلامی سوشلزم!

شہیدِ ملت کے فوراً بعد پاکستان میں جو سفاک سویلین آمریت قائم کر دی گئی تھی اُس کے درج بالا سرکردہ اراکین نے پاکستانی افسر شاہی میں فعال برطانوی افسران کے زیرِ اثر غیر جانبداری ترک کر کے سرمایہ پرست دُنیا کا آلہء کار بننے میں فخر محسوس کیا۔ یوں پاکستان سرد جنگ میں مغربی دُنیا کا اتحادی بن کر رہ گیا۔ امریکہ کی تاریخ کا یہ وہ تاریک عہد تھا جب سینیٹر میکارتھی امریکہ کو نیشنل سیکیورٹی سٹیٹ بنانے میں کوشاں تھے۔ وہ اِن بااختیار سیاستدانوں میں سے ایک تھے جو امریکی کیمونسٹ پارٹی کے ساتھ ساتھ وسیع النظر اور آزاد خیال دانشوروں اور سیاستدانوں کو بھی احتساب اور تعزیر کا نشانہ بنانے میں منہمک تھے۔ امریکی غلامی قبول کرنے کے بعد سینیٹر میکارتھی پاکستان کی انتظامی مشینری کا رہبر و رہنما بن گیا تھا۔ خوف و دہشت کی اِس فضا میں جب پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام کی غرض سے کراچی میں پاکستان کے ادیبوں کا کنونشن منعقد کرنے کی تیاریاں زوروں پر تھیں:

> ''بہت جلد مجھ سے اور میرے ذریعے جناب شہاب اور دیگر چھ دستخط کنندگان سے رابطہ معروف اور کھلے ترقی پسند پروفیسر ممتاز حسین اور جناب شوکت صدیقی نے اس موقف کے ساتھ کیا کہ ہم کنونشن کے ذریعے انھیں، ان کے تحفظ کا یقین دلوانے کا وعدہ کریں تو اس وقت کے زیرِ زمین اور پھر مقید کیمونسٹ لیڈر جناب حسن ناصر مرحوم کی رائے کے مطابق ترقی پسند برادری ہم سے بھرپور تعاون کا وعدہ کر سکتی ہے۔ ایسا ہی ہوا۔''(۲)

سرد جنگ کے تہذیبی محاذ پر بربریت کی اس یلغار کے اثرات و نتائج پر اظہارِ خیال کرتے وقت ڈاکٹر سعدیہ طور نے ہمارے لبرل دانشوروں کی فسطائیت پسندی کو خوب نمایاں کیا ہے۔ دنیائے اسلام میں علم و ادب اور تہذیب و فن کے اداروں میں ایک ایسا نیا بیانیہ متعارف کرایا گیا جس کی رُو سے اشتراکیت دوستی اور ترقی پسندی اسلام کے منافی قرار دے دی گئی:

> "By 1953, the US had been invited to intervene in Pakistan's political scene by the ruling clique at the center. In April 1954, Pakistan signed the Mutual Defence and Assistance Pact with the US, the first of many such formal alliances. A Pakistani branch of the Congress for Cultural Freedom, the organizational forum of this liberal

anti-communism backed by the CIA, was also in operation. A new chapter in Pakistan's history was about to commence."(3)

یہ بات انتہائی قابلِ غور ہے کہ اِدھر ۱۹۵۴ء میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دفاع اور تعاون کے باہمی معاہدے پر دستخط کیے اور اُدھر ۱۹۵۴ء میں ہی پاکستان کے گورنر جنرل نے انجمن ترقی پسند مصنّفین پر پابندی عائد کر دی۔ بعدازاں رفتہ رفتہ پاکستان امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کی سرپرستی اور نگرانی میں جاری کلچرل سرگرمیوں کے دائرۂ اثر میں آتا چلا گیا۔ ایوب خاں کے وزیرِ قانون اے کے بروہی امریکی CIA کی سرپرستی میں قائم 'کانگریس فار کلچرل فریڈم' کی پاکستانی شاخ کے سربراہ مقرر ہوئے اور یوں سرکاری سرپرستی میں CIA نے پاکستان کے ترقی پسند دانشوروں پر احتساب اور تعزیر کے دروازے کھول دیئے۔ سعد یہ طور داد تحقیق دیتے ہوئے اِس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ امریکی ماہرینِ علم و حکمت کی جانب سے ایوب آمریت کی تحسین بدنیتی پر مبنی تھی۔ یہ لوگ پاکستانی معاشرت اور سیاست کو تجدید و ترقی کی راہوں پر ڈالنے کے بجائے زوال و ادبار میں مبتلا رکھنے کے تمنائی تھے:

"The attitude of American social scientists towards the coup and Ayub Khan's dictatorship spoke volumes about their priorities. Their investment in authoritarianism as a tool for the management of "unruly" Third World societies was in direct contradiction to their purported concern with democracy; clearly, the concern was not so much with "modernizing" a traditional society as it was with managing a recalcitrant one."(4)

امریکی سینیٹر میکارتھی کی حکمتِ عملی کے زیرِ اثر کمیونسٹ، سابق کمیونسٹ اور کمیونسٹوں سے راہ و رسم رکھنے والے امریکیوں کو قومی مفاد کے نام پر شہری آزادیوں اور بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اشتراکی خطرے سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے یونیورسٹیوں، سینما گھروں، مزدور انجمنوں کے سے اداروں کی آزادیٔ فکر و عمل پر انتہائی ناروا پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اس صورتِ حال کے خلاف امریکی سپریم کورٹ کے جسٹس William O. Douglas نے بروقت صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ اُنھوں نے خیال کا مقابلہ خیال سے کرنے کے بجائے لاٹھی گولی سے کرنے کی سرکاری روش کی پُرزور مذمت کی تھی۔ خیالات پر فوج کشی کے مُضر اثرات کو نمایاں کرتے ہوئے اُنھوں نے خبردار کیا تھا کہ:

"This is alarming to one who loves his country. It means that the philosophy of strength through free speech is being forsaken for the philosophy of fear through repression.....The drift goes back, I think, to the fact that we carried over to days of peace the military approach to world affairs......Today in Asia we are identified not with ideas of freedom, but with guns. Today at home we are thinking less and less in terms of defeating communism with ideas, more and more in terms of defeating communism with military might."(5)

جسٹس ولیم اوڈوگلس نے وطن سے سچی محبت کو حریت فکر و عمل اور آزادی، اظہار سے تعبیر کرتے ہوئے امریکی قوم کو بروقت خبردار کیا تھا:

"The mind of man must always be free. The strong society is one that sanctions and encourages freedom of thought and expression......Our real power is our spiritual strength, and that spiritual strength stems from our civil liberties. If we are true to our traditions, if we are tolerant of a whole market place of ideas, we will always be strong. Our weakness grows when we become intolerant of opposing ideas, depart from our standards of civil liberties, and borrow the policeman's philosophy from the enemy we detest."(6)

امریکی حکومت نے اِس بروقت انتباہ کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ عقل و خرد کے بجائے جبر و تشدد پر انحصار کی حکمتِ عملی سکۂ رائج الوقت بن گئی۔ اِس حکمتِ عملی کے بیش از بیش اثرات نے سرد جنگ میں امریکہ کے اتحادی پاکستان کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ امریکہ میں جب سوویت یونین کے مفادات کے فروغ میں کوشاں رہنے کے الزام میں ایتھل اور جولیس روزن برگ کو موت کی سزا دی گئی تو فیض نے اپنی مشہور نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" میں

اُن کا سوگ یوں منایا تھا جیسے یہ اُن کی ذاتی واردات ہو:

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ نوحہ غم مایوسی سے شروع ہو کر اُمید اور ایقان پر تمام ہوتا ہے:

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عُشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے!

سن پچاس کی دہائی کے وسط میں جب فیض احمد فیض نے منٹگمری جیل میں روزنبرگ جوڑے کا یہ مرثیہ لکھا تھا تب میکارتھی ازم کی تاریک راہیں سات سمندر پار کر کے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ غلامانہ ذہنیت میں راسخ حکمران افسر شاہی کی نظر میں سرد جنگ کی مخالفت میں لب کشائی کرنے والا ہر شخص قوم و ملت سے غداری کا مرتکب ٹھہرا۔ سرد جنگ میں سرمایہ پرست دنیا کا اتحادی بن کر رہ جانے کے بعد میکارتھی ازم کے تاریک سائے پاکستان کے ادبی و ثقافتی آفاق کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ ۹ مئی ۱۹۵۱ء کو متعدد سرکردہ ترقی پسند ادیبوں کی گرفتاری اور احتیاطی نظر بندی عمل میں آ گئی تھی۔ اس قید و بند اور تعزیر و احتساب کی سرگزشت حمید اختر نے اپنی کتاب "کال کوٹھڑی" (مطبوعہ ۱۹۵۳ء) میں تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کر رکھی ہے۔ اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے بھی اس روداد قفس کو رسالہ نقوش کے دو شماروں میں "زندان و سلاسل" اور "مہر بہ لب" کے عنوانات سے شائع کر دیا تھا۔ الطاف گوہر نے اپنی کتاب: "ایوب خان ,فوجی راج کے پہلے دس سال" میں لکھا ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ سید امجد علی اور جنرل ایوب خان نے امریکہ جا کر سی آئی اے کی وساطت سے امریکی قیادت کی منت سماجت کی کہ وہ پاکستان کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لے:

"اپریل ۱۹۵۸ء میں ایوب خان کا فوجی امداد کے حصول کے لیے امریکی دورہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا۔ ایوب خان اور سید امجد علی کی کوششوں سے امریکی سی آئی اے اس امر

سے متفق ہو گئی کہ اگر پاکستان میں عام انتخابات کے نتیجے میں بائیں بازو کے سیاستدان برسراقتدار آ گئے تو ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ امریکہ کو بتایا گیا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور سیاستدان فروری ۱۹۵۹ء میں انتخابات کرانے کی سازشوں میں مصروف ہیں اور اگر یہ انتخابات ہو گئے تو مشکوک کردار اور اشتراکی ذہنیت کے حامل سیاستدانوں کی ایک بہت بڑی تعداد انتخابی عمل میں کامیابی حاصل کر لے گی۔"(۷)

چنانچہ امریکہ کی تائید و حمایت سے سن چھپن کا آئین بھی منسوخ ہوا، اُس کے تحت ہونے والے انتخابات بھی سن اٹھاون کے مارشل لاء کے نتیجے میں متروک قرار پائے۔ یوں پاکستان میں ایوب خاں کی "مہربان آمریت" قائم ہو گئی جس کے نتیجے میں جمہوریت "بنیادی جمہوریت" بنا کر رکھ دی گئی۔ ایوب خاں کے دورِ آمریت میں پاکستان کے ادبی اور تہذیبی آفاق پر میکارتھی ازم کے وہ سائے مزید گہرے ہو گئے جو لیاقت علی خان کی شہادت کے فوراً بعد چھا گئے تھے۔ پاکستان میں آغاز کار ہی سے انسان دوست اور وسیع النظر ادیبوں اور سکہ بند کمیونسٹ ادیبوں کے درمیان محاذ آرائی شروع ہو گئی تھی۔ سعدیہ طور نے اپنی کتاب The State of Islam میں اِس ادبی، فکری اور سیاسی تصادم کو بجا طور پر پاکستانی قوم پرستی اور کمیونسٹ آمریت کے درمیان تصادم قرار دیا ہے:

The liberal writers thought of themselves, first and foremost, as patriots who were committed to putting their considerable energies and talents in the service of their new nation-state. Crucially, they defined this project of nation-building strongly identified the nation with the state."(8)

ایک طرف تحریکِ پاکستان کے خواب و خیال کو پاکستان کی عملی زندگی میں ڈھالنے کی قوم پرست تمنائیں اور دوسری جانب بھارت نواز کیمونزم کی تکریم و توصیف۔ فکر و نظر اور ادب و فن کی دُنیا میں یہ سنگین کشمکش روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ سرد جنگ کے ناخداؤں نے اِن مواقع سے بیش از بیش فائدہ اُٹھایا۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۴ء ہی وہ سال ہے جس میں سرد جنگ میں پاکستان اور امریکہ کے مابین اتحاد کا معاہدہ: Mutual Defence and Assistance Pac عمل میں آیا تھا۔ اسی دور میں وسیع النظر اور آزاد خیال ادیبوں اور دانشوروں کو ایسی بین الاقوامی تنظیموں کی رُکنیت اختیار کرنے پر مائل کیا گیا جو بظاہر آزاد تھیں مگر بباطن مغربی خفیہ ایجنسیوں کی آلہ کار تھیں۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا زور

توڑنے کی خاطر پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا۔ سعدیہ طور نے بجا طور پر اس کاوش کو سرکار پسند ادیب (Establishment Writer) کی تلاش و جستجو قرار دیا ہے۔(۹) مولانا صلاح الدین احمد نے گلڈ کے قیام پر متعجب ہو کر یہ سوال اُٹھایا تھا کہ کیا پیغمبروں نے بھی کبھی گلڈ بنائے ہیں؟ حبیب جالب نے 'رائٹرز گلڈ' کے عنوان سے اپنے ایک قطعہ بند میں اسی صداقت کا اظہار کر رکھا ہے:

ذہانت رو رہی ہے منہ چھپائے
جہالت قہقہے برسا رہی ہے
ادب پر افسروں کا ہے تسلط
حکومت شاعری فرما رہی ہے

جس وقت صدر ایوب کی صدارت میں پاکستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کے کنونشن میں پاکستان رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تھا اُس وقت فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی اسیر زنداں تھے۔ اس کے باوجود تمام سرکردہ ترقی پسند اور تمام سربرآوردہ اشتراکیت پسند اس کنونشن میں شریک تھے۔ ان سب لوگوں نے بخوشی پاکستان رائٹرز گلڈ کی رُکنیت قبول کر لی تھی۔ بعد ازاں جب فیض اور ندیم جیل سے رہا ہوئے تو تھوڑے بہت لیت ولعل کے بعد اُنھوں نے بھی گلڈ کی رُکنیت قبول کر لی تھی۔

ترقی پسند ادیبوں کی بھاری اکثریت کی پاکستان رائٹرز گلڈ میں شمولیت پاکستان میں امریکی غلامی پر نازاں سرکاری انتظامیہ کو ایک نظر نہ بھائی۔ چنانچہ روزِ اوّل ہی سے صدر ایوب کے سیکرٹری اور اُردو کے نامور تخلیق کار قدرت اللہ شہاب کے نام خُفیہ ایجنسیوں کے نامے موصول ہونے لگے۔ رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری اور سرگرم ترین قائد جمیل الدین عالی نے اپنے مضمون بعنوان ''ایک اور احتساب کی جھلکیاں'' میں فقط چند حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ ان حقائق کے ثبوت میں اُنھوں نے قدرت اللہ شہاب کے نام وزارتِ داخلہ کے ڈپٹی سیکرٹری ایس ایم ایوب کی وہ خفیہ مراسلت بھی شائع کر دی ہے جو وقت گزرنے کے بعد صیغہ ءراز کی پابندی سے آزاد ہو کر اب خفیہ نہیں رہی۔ ہر چند یہ مراسلت کہ مشتے نمونہ از خروارے کی مثال ہے تاہم اس سے پاکستان کے ادبی اور تہذیبی آفاق پر میکارتھی ازم کے تاریک سایوں کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جمیل الدین عالی نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ''خفیہ'' کے اداروں کے ادیبوں کے ساتھ ناروا سلوک کو بے نقاب کیا ہے۔ ان خفیہ رپورٹس کی بنیاد پر ہی:

> ''بہت سے ادیب نوکری سے محروم رہتے اور محروم کر دیے جاتے۔ انہی کی بنیاد پر پاسپورٹ ملنے نہ ملنے، پاسپورٹ مل بھی جائے تو باہر جانے نہ جانے کا معاملہ طے ہوتا، انہی کی بنیاد پر (ٹی۔وی تو اس وقت تھا نہیں) ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں شرکت یا ممانعت طے

ہوا کرتی۔ اس سلوک اس رویے کے ذمہ دار وہ حکمران تھے جو اپنی بقا کی ہوس اور عدم تحفظ کے خوف میں ہر روشن خیال ادیب، صحافی، استاد، سرکاری اور نیم سرکاری ملازم کی کڑی نگرانی پسند تو کرتے تھے ہی لیکن اس وقت سب ایک طرح اس مغربی (امریکی) پالیسی کے تابع بھی لگتے تھے جو "میکارتھی ازم" کہلاتی تھی۔ میکارتھی ازم پانچویں دہائی کے وسط تک تو اپنی پوری سفا کی کے ساتھ امریکہ، امریکہ کے ممنونین اور اس سے متاثرین میں کارفرما رہا۔ اس کے اثرات پانچویں دہائی کے بعد بھی خاصی مدت تک محسوس کیے جاتے رہے۔ پانچویں دہائی میں پاکستان کے اندر بہت سے غیر کمیونسٹ مگر روشن خیال صحافی اور ادیب بھی محض شبے میں مختصر اور طویل عرصوں کے لیے قید و بند سے دو چار ہوئے۔ بعض اس طرح بھی کہ ان پر کوئی باقاعدہ مقدمہ نہیں چلایا گیا (حالانکہ کمیونسٹ ہونا بھی کون سا گناہ تھا۔) ۱۹۷۳ء میں پارٹی پر سے پابندی ہٹا دی گئی۔ اس وقت کے آج بھی موجود ادیب اور قاری گواہ ہیں کہ وہ کیسی گھٹن اور ظلم کا ماحول تھا۔ ہم ریڈیو پاکستان کے مشاعروں تک میں اپنی منظومات پیشگی افسران متعلقہ کو دکھانے، سنسر کرانے کے پابند تھے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ملازمین کے خالص ادبی مسودات کو متعلقہ محکمے (اور پھر متعلقہ محکمے کو بصیغہ راز، وزارت داخلہ) سے اشاعت کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ آج بہتوں کو اس بیان پر بمشکل یقین آئے گا۔"(۱۰)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالی صاحب نے اپنی اس تحریر کے ساتھ جو چند دستاویزات منسلک کی ہیں اُن پر بھی عبرت کی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس ضمن میں وزارت داخلہ کا پہلا خط ۸ مئی ۱۹۵۹ء درج ذیل ہے:

IMMEDIAT/SECRET

Subject: All Pakistan Writers' Convention held in Karachi in January 1959 - infiltration of Communists in the Executive Committee.

My dear Shahab,

May I draw your attention to this Division's letter of even number, dated the 6th April, 1959, on the subject mentioned above. The formation of the Writers' Guild has given some encouragement to pro-Communist Writers'

Association and Anjuman Azad Khayal Mussanifeen, they apparently wish to re-appear in another garb.

They are endeavouring to get more representations in the Central Executive Committee next year as the elections would be based on the recommendations of the Regional bodies.

No one, allow me to think, would like to take deterrent action against such tendencies as yourself.

Regards,

Yours sincerely,

S.M. Ayub

قدرت اللہ شہاب کے نام ''خفیہ'' کی جانب سے ۹ ستمبر ۱۹۵۹ء کے خط میں جنوری ۱۹۵۹ء کے سہ روزہ کراچی کنونشن میں شریک اُن دوسومندوبین کی فہرست دی گئی ہے جنھیں ہماری خفیہ والے Known pro-Communist or "Progressive" ادیبوں میں شمار کرتے ہیں۔ اس فہرست میں قرۃ العین حیدر، اعجاز بٹالوی، جمیل جالبی، ابن انشا کے سے ''ترقی پسندی'' سے بیزار ادیبوں کے نام بھی موجود ہیں۔ جب میں نے اس فہرست پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تو مجھے اُس زمانے کے ادیبوں میں گردش کرنے والا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک ادیب کو حراست میں لیتے وقت جب یہ بتایا گیا کہ اُس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے تو اُس ادیب نے حیرت زدہ ہو کر اعلان کیا کہ وہ تو اینٹی کمیونسٹ ہے۔ اس پر اُس افسر نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ بھئی اینٹی کمیونسٹ بھی تو آخر کمیونسٹ ہی ہے، تم چاہے جس بھی قسم کے کمیونسٹ ہو، مجھے اس سے غرض نہیں، بس چلو میرے ساتھ!

قدرت اللہ شہاب اور اُن کے قریب ترین رفقا اپنی ادب دوست حکمتِ عملی کے ساتھ ادیبوں کو اس ناروا احتساب سے بچاتے رہے مگر وہ خود زیادہ دیر تک اِن خفیہ ایجنسیوں سے محفوظ و مامون نہ رہ سکے۔ بہت جلد انھیں بیرونِ ملک سفارت کاری کی ذمہ داری سونپ کر ایوانِ صدر سے چلتا کر دیا گیا۔ ایوانِ صدر میں اُن کی ذمہ داریاں اب الطاف گوہر کے سپرد کر دی گئیں۔ انھوں نے آتے ہی گلڈ کی جگہ ایک نئی تنظیم کا ڈول ڈالا۔ اِس تنظیم کا ذکرِ خیر جمیل الدین عالی ہی سے سنیے:

''۱۹۶۵ء میں ایک بہت طاقتور سرکاری گروپ نے ایک ''تھنکرز فورم'' لاہور میں قائم کرایا۔ ادیب کو تو کچھ نہ کچھ ثبوت ادبیت دینا ہی ہوتا تھا۔ ''تھنکر'' تو وہ، جسے پیا چاہے۔ ایک بڑا

اجلاس بلایا گیا۔ اس میں فیض صاحب کے ذریعے ملک راج آنند کو بھی دعوت دی گئی اور وہ آئے بھی۔ صدور کون تھے؟ صدر ایوب مرحوم اور شہنشاہِ ایران۔ میں اس وقت نیشنل پریس ٹرسٹ کا تنخواہ دار سیکرٹری تھا۔ (یا شاید نامزد رجسٹرار کاپی رائٹ کا چارج پریس ٹرسٹ کے لیے چھوڑ رہا تھا) مدعو تھا لیکن نہیں گیا۔ گلڈ کو کسی طور مدعو بھی نہیں کیا گیا اور نامزدگی بھی نہیں مانگی گئی۔ شہاب صاحب ۱۹۶۳ء میں ہالینڈ جا چکے تھے۔ میں مرکزی معتمدی لیے بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح خالص اعزازی، رضا کارانہ، میں نے کھل کر تو مخالف نہیں کی لیکن اپنا یہ موقف منتظمین پر واضح کر دیا کہ گلڈ کو چند مندوب بھیجنے کا اختیار دینا چاہیے تھا۔ منتظمین میں آگے آگے میرے اوائل کراچی کے بہترین دوستوں میں شامل اور جناب الطاف گوہر (اس وقت معتمد وزارت اطلاعات) کے برادرِ خورد ربجہ تجمل حسین تھے۔ (وہ مجھے آج بھی انتہائی عزیز ہیں) معاہدہ بغداد ختم ہو جانے (۱۹۶۰ء) کے بعد آر سی ڈی (ریجنل ڈیولپمنٹ) پاکستان، ایران اور ترکی کے مقاصد مشترکہ، بہت کچھ (میری رائے میں دراصل سرد جنگ میں امریکہ کی تابعدارانہ حصہ داری) قائم ہوئی تھی۔ کہا جاتا تھا ''تھنکرز فورم'' کو ان مقاصد کا انٹیلیکچوئل فورم بنایا جائے گا، واللہ اعلم۔ (ملاحظہ ہوں اخبارات) بہر حال جلسہ تو خبروں کے مطابق بڑا شاندار ہوا۔ بے شمار ادیب بھی شریک ہوئے (وہ بھی جو گلڈ کو مارشل لائی پیداوار کہتے نہیں تھکتے) بڑے منصوبے بنے۔ کنوینر ربجہ تجمل حسین اس وقت کمشنر انکم ٹیکس پنجاب تھے۔ حکومت (وزارتِ اطلاعات) کی سپورٹ ظاہر ہی تھی۔ ایک جریدہ شائع کرنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا گیا۔ رکن ادارت جمیلہ ہاشمی مقرر ہوئیں۔ واپڈا بلڈنگ لاہور میں ایک وسیع کمرہ بھی لے لیا گیا۔ لوگوں نے کہا حکومت کی سپورٹ گلڈ سے شفٹ ہو کر اس فورم کی طرف ہوگئی ہے لیکن وہ فورم بہت جلد غیر فعال ہو کر نہ جانے کب ختم ہو گیا؟''(۱۱)

درج بالا سطور میں جمیل الدین عالی نے نیشنل پریس ٹرسٹ کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ پریس ٹرسٹ بھی نیشنل کم اور امریکن زیادہ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد بھی پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے سلسلہء اخبارات و جرائد کو قومی تمناؤں کی ترجمانی کے بجائے سرد جنگ میں امریکی بلاک کے اغراض و مقاصد کا آلہء کار بنا دینا تھا۔ جس زمانے میں یہ مذموم پابندی عمل میں آئی اُس زمانے میں پاکستان کے ترقی پسند ادیب (جن پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے) اِن اخبارات و رسائل میں لکھ کر اپنی گذر اوقات کیا کرتے تھے۔ پروگریسو پیپرز پر نام نہاد نیشنل پریس ٹرسٹ کے تسلط سے ترقی پسند فکر و دانش کے یہ سرچشمے بھی خشک ہو کر رہ گئے تھے۔ اب سرد جنگ میں سرمایہ پرست دنیا کی وکالت اِس سلسلہء اخبارات و جرائد کا نیا مسلک قرار پایا تھا۔

یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سرکاری تحویل میں آنے کے بعد معاہدہ، بغداد کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل محمد سرفراز کو پروگریسو پیپرز کا پہلا انتظامی سربراہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ سرفراز صاحب قدرت اللہ شہاب کی نگرانی میں انتظامی فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ ان اخبارات وجرائد پر سرکاری تسلط قائم ہوتے ہی کارکنوں پر Essential Services Act نافذ کر دیا گیا تھا۔ اس قانون کی رُو سے کوئی بھی کارکن خود سے مستعفی نہ ہوسکتا تھا البتہ حکومت جسے چاہے ملازمت سے برخواست کرسکتی تھی۔

صدر ایوب کے دورِاقتدار کے آخری سالوں میں جب ذوالفقار علی بھٹو اور مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی عوامی جمہوری تحریک کے زیرِ اثر انسانی اخوت ومساوات اور معاشی عدل وانصاف کے انقلابی مطالبات دلوں میں گھر کرنے لگے تو میکارتھی ازم کے سائے برق رفتاری کے ساتھ چھٹتے چلے گئے۔ ایسے میں ایوب آمریت اور اُس کے ہواخواہ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ۳۰۔ اپریل ۱۹۷۰ کو اپنی ذاتی ڈائری میں ترقی پسند دانشوروں کی روزافزوں مقبولیت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''کچھ لوگ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں نے اپنے دورِاقتدار میں کمیونسٹوں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ حقائق کی تکذیب ہے۔ مجھے اس کارستانی سے کیا حاصل تھا؟ اس کے برعکس میں نے کمیونزم کی ترویج واشاعت پر وہ تمام پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جو میرے بس میں تھیں۔ اسی ضمن میں میں نے پروگریسو پیپلز لمیٹڈ کو سرکاری تحویل میں لے کر ایک نیشنل ٹرسٹ کی شکل دے دی تھی۔ یہ سلسلہ، اخبارات کمیونزم کی نشرواشاعت کا بہت بڑا ذریعہ تھا۔ میں نے اِس پر سرکاری قبضہ اور ایسے ہی دیگر اقدامات سے اِن عناصر کو گرفت میں لے لیا تھا۔ میرے دورِاقتدار کے ختم ہوتے ہی یہ عناصر اب پھر سے کُھل کھیلنے لگے ہیں۔''(۱۲)

انجمن ترقی پسند مصنفین: نیا منشور

ترقی پسند مصنفین کی دوسری ملک گیر کانفرنس ۱۹۵۲ء میں کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پیش کیے گئے مقالات میں سکہ بند اشتراکی ادیبوں نے بھی اپنے پہلے منشور کی انتہا پسند حکمتِ عملی کو خیرباد کہہ کر پھر سے انجمن کو مختلف الخیال ادیبوں اور دانشوروں کا متحدہ محاذ بنانے کا عہد کیا تھا۔ انجمن کے منشور میں اس خوشگوار تبدیلی اور انجمن کے پہلے منشور کے سخت گیر ناقدین کی جانب سے بھی نئے منشور کی پُرزور حمایت کے باوجود سرکاری ایجنسیوں کی جانب سے ترقی پسندوں کے احتساب میں کمی تو درکنار روزافزوں شدت پیدا ہوگئی۔ اس صورتِ حال کی ایک جھلک درج بالا سطور میں پیش کی جاچکی ہے۔ نئے منشور کی روشنی میں انجمن کی ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے بجائے پرزور حوصلہ شکنی کی گئی۔ یہاں تک

کہ لاہور کے سے مرکزِ علم وادب میں بھی انجمن کے ہفتہ وار ادبی اجلاس منعقد کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو کر رہ گیا۔ وائی ایم سی اے سے اُٹھ کر ڈھکانے تلاش کرتے کرتے انجمن مظہر علی خان کے گیراج تک پہنچی مگر پھر نہ جانے کہاں غائب ہوگئی؟ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر ادبی مرکز میں انجمن کے ادبی اجلاسوں پر یہی بیتی۔ ایسے میں انجمن کے سیکرٹری جنرل احمد ندیم قاسمی اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ رفیق چوہدری نے ترقی پسند تحریک سے متعلق اپنی یادوں کی کتاب ''میری دُنیا'' میں قاسمی صاحب کے یوں مستعفی ہوجانے پر گہرے رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے قاسمی صاحب کے اس اقدام کو انجمن کے انتشار کا سبب بتایا ہے۔ قاسمی صاحب نے اس پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انجمن تو پہلے ہی سے منتشر ہو چکی تھی:

> ''میں نے ۱۹۵۴ء میں اپنے استعفیٰ کا اعلان کرتے ہوئے نہایت وضاحت سے عرض کردیا تھا کہ میری بار بار کی یاددہانیوں کے باوجود مشرقی اور مغربی پاکستان کی کوئی بھی شاخ اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ اس طرح انجمن جامد اور غیر فعال ہو کر رہ گئی ہے اور ایک ایسی انجمن کا سربراہ بن کر بیٹھے رہنا جو عملاً معطل ہو، میرے نزدیک قطعی بے معنی صورت حال ہے۔ اس لیے میں اپنے عہدے سے مستعفی ہوتا ہوں اور کسی بھی سینئر ساتھی کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس منصب کو سنبھال لیں۔ رفیق چودھری صاحب کو میرے استعفے کے تذکرے میں میرے اس بیان کو بھی شروع سے آخر تک درج کرنا چاہیے تھا مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور شاید اس لیے ایسا نہیں کر سکے کہ انھیں یہ بیان دستیاب نہ ہوا، ورنہ وہ میرے استعفے کا پس منظر بیان فرماتے ہوئے اس طرح کی فاش فروگذاشتوں کے مرتکب نہ ہوتے۔''(۱۳)

احمد ندیم قاسمی نے درست فرمایا ہے کہ جب انجمن منتشر ہو کر رہ گئی تھی تب وہ یہ کہہ کر مستعفی ہوگئے تھے کہ جو بھی ترقی پسند رفیق انجمن کے اس انتشار کو اتحاد میں بدلنے کے لیے آگے بڑھے گا وہ اُس کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ انجمن کے سینئر ترین اراکین میں سے کسی نے بھی آگے بڑھ کر انجمن کو فعال بنانے کا فریضہ سرانجام نہیں دیا۔ میکارتھی ازم کے باب میں درج بالا مندرجات سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ پاکستان میں مارکسی انقلاب کے خواب دیکھنے والوں میں سے ہر کوئی جمیل الدین عالی اور قدرت اللہ شہاب سے جسم وجاں کی سلامتی کا خواستگار تھا۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆

حواشی

۱۔ بس اک گوشہ بساط، جمیل الدین عالی، کراچی، دسمبر ۲۰۰۳ء، صفحہ ۳۵۸

۲۔ ایضاً، صفحہ ۳۹۱

3. The State of Islam, Saadia Toor, Newyork, 2011, p.79

4. Ibid., Pp. 86

5. The Black Silence of Fear, William O. Douglas, New York Times Magazine, 13 Jan. 1952, 7,37

6. Ibid. p.38

۷۔ سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۱۵

8. The State of Islam, Saadia Toor, Newyork, 2011, p.57

9. Ibid., p.86

۱۰۔ رسالہ 'دنیائے ادب'، جمیل الدین عالی نمبر، کراچی، ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۱۱۷

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۸۲۴

12 (a). Diaries of Field Marshal Muhammad Ayub Khan, 1966-1972, Craig Baxter (Edit.), Oxford, 2007, p.382

۱۲۔ (ب) اکمل شہزاد گھمن نے اپنی کتاب ''میڈیا منڈی'' میں اس سانحہ عظیم پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''ملک میں پہلے (ایوبی) مارشل لاء کے نفاذ کے چند مہینوں بعد ہی ۱۸۔اپریل ۱۹۵۹ء کو پاکستان سکیورٹی ایکٹ کے تحت پی پی ایل کے زیر اہتمام پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل ونہار کو حکومتی قبضے میں لے لیا گیا جس کے ساتھ ہی پاکستان میں معیاری صحافت کا ایک اور باب بند ہو گیا۔ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مظہر علی خان، امروز کے احمد ندیم قاسمی اور لیل ونہار کے سبطِ حسن کسی بھی صورت فوجی حکومت کے زیر سایہ کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لہٰذا ان سب نے استعفیٰ دے دیا۔ قبضہ گیری کے اس ''کارِ خیر'' میں ایوبی مارشل لاء کے کل پرزوں نے حصہ لیا جن میں وزیر داخلہ، جنرل کے ایم شیخ، ایوب خاں کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب، وزارت اطلاعات کے انچارج بریگیڈیئر ایف آر خاں اور ایوبی کابینہ کے وزیر ذوالفقار علی بھٹو بھی نمایاں تھے۔ اگلے روز پی پی ایل کے اخبارات، پاکستان ٹائمز اور امروز شائع ہوئے تو اُن میں قدرت اللہ شہاب کا تحریر کردہ ایڈیٹوریل نیا ورق (New Leaf) کے عنوان سے چھپا جس میں اُنھوں نے پی پی ایل کے اخبارات پر کئی گھناؤنے الزامات عائد کیے جنھیں کبھی ثابت نہ کیا جا سکا۔ موصوف نے لکھا کہ ''مذکورہ ادارے کے اخبارات سرحدوں کے باہر سے نظریاتی رہنمائی لیتے تھے اور تقسیم کے بعد میاں افتخار الدین پاکستانی سیاست میں اور ان کے اخبارات، اخباری دنیا میں اجنبی دکھائی دیتے تھے۔'' قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت ''شہاب نامہ'' میں اس حوالے سے سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے اپنی مجبوری کا تذکرہ کر کے صفائی بھی پیش کی ہے مگر یہ بات پورا سچ نہیں لگتی کیونکہ سرکاری قبضے کے بعد شہاب کے دستِ راست محمد سرفراز کو پی پی ایل کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا تھا۔ مزید برآں جنرل کے ایم شیخ اور ذوالفقار علی بھٹو، مظہر علی خاں کو پاکستان ٹائمز اور قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی کی ادارت سنبھالے رکھنے کے لیے مناتے رہے۔'' (میڈیا منڈی، لاہور، ۲۰۱۵ء، صفحات ۳۱۰۔۳۱۱)

۱۳۔ رفیق چوہدری کی تصنیف ''میری دنیا'' چند وضاحتیں، احمد ندیم قاسمی، روزنامہ امروز، ۱۸ فروری ۱۹۸۷ء۔

باب ششم

تنظیم ختم، تحریک رواں دواں

احمد ندیم قاسمی کے مستعفی ہونے کے بعد جب کوئی بھی نامور ترقی پسند دانشور انجمن کی تنظیم نو کے لیے آگے نہ بڑھا تو تنظیمی اعتبار سے انجمن ترقی پسند مصنفین ختم ہو کر رہ گئی۔ ترقی پسند تنظیم کے رفت گزشت ہو جانے کے بعد بھی ترقی پسند ادبی تحریک اُسی انداز میں جاری و ساری رہی جس انداز میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے مدتوں پیشتر ترقی پسند ادبی تحریک رواں دواں تھی۔ ترقی پسند تحریک کے اس مشکل دور میں احمد ندیم قاسمی اپنی تخلیقی قوت کے ساتھ ساتھ اپنی ادارتی اور صحافتی سرگرمیوں کی بدولت مرکزی حیثیت اختیار کر گئے۔ اُن کا ادبی مجلّہ ''فنون'' اور اُن کا ادبی کالم 'تہذیب و فن' زندگی اور ادب کے ترقی پسند اصول و اقدار کی ترجمانی میں ادیبوں کی نئی نسل کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کے دورِ حکومت میں جب پاکستان کے تہذیبی آفاق پر سے میکارتھی ازم کے سائے چھٹ سے گئے تب احمد ندیم قاسمی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ازسرِ نو تنظیم کی خاطر ترقی پسندی کا دم بھرنے والے ادیبوں اور دانشوروں کو صدا دی۔ اس باب میں یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو اُنھوں نے پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں مقیم ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک گشتی مراسلہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں اُنھیں ملا جُلا ردِعمل موصول ہوا۔ بیشتر ادیبوں نے اس تجویز کا خیر مقدم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو روبہ عمل لانے میں درپیش مشکلات پر روشنی بھی ڈالی۔ رفیق چوہدری نے کراچی کے سرکردہ ادیبوں کا ایک اجلاس بُلا کر غور و فکر کیا۔ اِس اجلاس میں مجتبیٰ حسین، مرزا ظفرالحسن، سحر انصاری اور شوکت صدیقی سمیت متعدد ادیبوں نے شرکت کی اور ندیم صاحب کو انجمن کے قیام میں تعاون کا یقین دلایا۔ احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے طویل اور مدلل خطوط میں سید سبطِ حسن اور مرزا ظفرالحسن نے اِس باب میں ندیم صاحب کو اپنے تعاون کا یقین بھی دلایا اور ادبی برادری میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کٹھن مشکلات کے موضوع پر بھی اپنا استدلال پیش کیا۔ فیض احمد فیض نے اس مسئلے کو ''پیچیدہ اور تفصیل طلب'' بتایا۔ ندیم صاحب کے نام اُن کا ۲۴ دسمبر ۱۹۷۵ء کا خط درج ذیل ہے:

''برادرِ عزیز۔ سلام مسنون

انجمن ترقی پسند مصنفین کے بارے میں آپ کا یکم دسمبر کا لکھا ہوا خط حال ہی میں

> موصول ہوا۔ اس لیے کہ جب سے میں سفر میں تھا۔ یہ مسئلہ پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے۔اس لیے بہتر ہوگا کہ اس پر بالمشافہ گفتگو کر لی جائے۔ میں کل ہی کراچی سے لوٹا تھا اور آج پھر واپس جارہا ہوں۔ تین چار دن تک واپسی ہوگی۔اس کے بعد، انشاء اللہ، آپ سے ملاقات کی کوئی صورت طے کرلیں گے۔
>
> مخلص
>
> فیض احمد فیض'' (۱)

نہیں معلوم ہر دو شخصیات کے درمیان اس ''پیچیدہ اور تفصیل طلب'' مسئلے پر کیا گفتگو ہوئی؟ گفتگو ہوئی بھی یا نہیں۔البتہ یہ معلوم ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تجدید اور تعمیرِ نو کی یہ بیل کبھی منڈھے نہ چڑھی۔البتہ دس برس بعد لندن میں کانفرنس کے جشنِ زریں کی تین روزہ تقریبات کا آغاز ۳۔اگست ۵۰ ء کو ہوا۔ سید عاشور کاظمی، فارغ بخاری، بخش لائل پوری، جاوید حکیم قریشی اور امین مغل نے ان تھک محنت سے اس کا اہتمام کیا تھا۔ (۲) اس تین روزہ کنونشن میں پاکستان، ہندوستان اور رُوس سے مندوبین شریک ہوئے تھے۔اس کے مشترکہ اعلامیہ میں افریشیائی اقوام پر بیرونی نوسامراجی تسلط اور اندرونی فوجی آمریت کے مذموم اثرات کے خلاف آزادی وانصاف کی قوتوں کے استحکام اور اتحاد میں ادیب کے کردار کو متعین کیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ محکوم اور مظلوم قوموں میں فلسطین کی تحریکِ آزادی کی حمایت تو موجود ہے مگر کشمیری حریّت پسندوں کا ذکر مفقود ہے۔ (۳) پاکستانی وفد کے اراکین نے لندن سے واپسی پر پاکستان میں انجمن کا جشنِ زریں منانے کی تیاریاں شروع کیں تو احمد ندیم قاسمی نے میرے نام ایک ذاتی خط (۲۹۔اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں اپنے ساتھ اِن لوگوں کی بدسلوکی کا اظہار درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

> ''آپ کو یہ سن کر حیرت بھی ہوگی اور غصہ بھی آئے گا کہ جن ترقی پسندوں نے لندن میں کانفرنس کی اور اب کراچی میں ایک اجتماع برپا کرنے چلے ہیں، انھوں نے مجھے Collaborator قرار دے کر ''غیر ترقی پسند'' بنادیا ہے۔اس کے سرغنہ سبطِ حسن صاحب ہیں جن کے نام میں نے ''شعلۂ گل'' معنون کر رکھا ہے۔ پنجاب میں عبداللہ ملک، فخر زمان اور صفدر میر..... حد یہ کہ صفدر میر بھی..... ان کے نمائندہ ہیں۔ مجھے محمد علی صدیقی صاحب نے لکھا تھا کہ نوجوان ترقی پسندوں کے سامنے آپ کو ترقی پسند ثابت کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ میں نے انھیں لکھا ہے کہ مجھے رجعت پسند ہی رہنے دیجیے۔ میری ترقی پسندی میری اپنی ترقی پسندی ہے اور مجھے کسی کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اس لیے اطلاع دے رہا ہوں کہ یہ لوگ گذشتہ ۳۸ سال میرے کاندھوں پر سوار ہو کر اچکتے رہے اور اب میں ہی، محض اس لیے راندہ

درگاہ قرار دے دیا گیا ہوں کہ اہلِ قلم کانفرنسوں میں شرکت کرتا رہوں، ستارہ، امتیاز حاصل کرتا رہا ہوں اور فوجیوں کی کتابوں کی افتتاحی تقاریب میں شمولیت کرتا رہا ہوں..... جبکہ وہ لوگ سرمایہ داروں کی چاکری کرنے اور نواب لوگوں اور جاگیرداروں کے ساتھ شراب نوشی کرنے کو اپنے سوشل سٹیٹس کی معراج سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ صورتِ حال ہے۔ ایسے رجعت پسندوں نے اب تک مجھے ہدف بنا رکھا ہے مگر کمیونسٹ ترقی پسندوں کی اس سے تشفی نہیں ہوتی۔''

اسی ضمن میں ایک اور خط (۷۔اکتوبر ۱۹۸۵ء) میں لکھتے ہیں:

''لندن کی کانفرنس دراصل کٹر کمیونسٹوں اور کٹر روس پرستوں کی کانفرنس تھی۔ اس پلیٹ فارم پر سے ان منافق دوستوں نے جس سیر چشمی سے مجھے نظر انداز کیا، اس سے مجھے تو خیر کیا نقصان پہنچے گا، خود ان کی منافقت تماشا بن گئی۔ فارغ صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ''ہماری'' اس کانفرنس کے خیر مقدم میں تم بھی لکھو۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ اگر میں نے لکھا تو آپ کے ترقی پسند دوست اپنی دھجیاں سمیٹتے پھریں گے۔ جانے دیجئے۔ آپ نے اچھا کیا کہ کانفرنس میں شامل نہیں ہوئے۔ یہ ایک سیاسی ڈھونگ تھا۔ میں نے اخباروں میں آپ کی تصویر دیکھی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ آپ لندن تشریف لے گئے تھے اور ضیاء جالندھری صاحب کی تقریب میں شامل ہوئے تھے۔ ذرا سی تشویش ہوئی تھی کہ کہیں کانفرنس میں نہ چلے گئے ہوں۔ آپ کے خط نے یہ تشویش دُور کر دی۔''

جب پاکستان میں انجمن کے جشنِ زریں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تب (۳۰۔اپریل ۱۹۸۶ء):

''ترقی پسند مصنفین کا ایک وفد اجلاس کے انعقاد سے دو چار روز پہلے مجھے رضامند کرنے آیا تھا۔ کشور ناہید، صفدر میر، مسعود اشعر اور فخر زمان اس وفد میں شامل تھے۔ ظہیر بابر کو بطور ''سفارشی'' ساتھ لائے تھے۔ میں نے جب پیشہ ور سیاسی ترقی پسندوں کی زیادتیوں کا ذکر کیا تو سب منہ بسور کر بیٹھ گئے۔ پھر مایوس ہو کر چلے گئے۔ پھر جب اخبار میں پہلے اجلاس کی تصویر دیکھی تو ایک بار تو میرا سارا خون میرے سر میں جمع ہو گیا کہ ہاجرہ اور ظہیر ''پریزیڈیم'' میں شامل بیٹھے ہیں۔ میں نے کسی کو وہاں جانے سے روکا نہیں تھا کیونکہ میں disruptionist نہیں کہلانا چاہتا تھا، چنانچہ ہاجرہ کو فون پر یہی کہا تھا کہ چلی جانا، شرکت کر لینا مگر نمایاں نہ ہونا۔ یہ تصویر دیکھ کر تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے اسے لکھا کہ میں نے یہ تصویر اپنی زندگی کے ایک سنگِ میل کے طور پر کاٹ کر رکھ لی ہے کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ہاجرہ

اور ظہیر سے پیشگی کوئی ذکر نہیں ہوا تھا اور یکا یک ان کے ناموں کا اعلان ہوا تو انھیں کوئی راہِ فرار نہ سوجھی۔ سارا مجمع پلٹ کر انھیں دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ وہ مجبوراً اسٹیج پر چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ آئی اے رحمٰن نے ہیرلڈ کے تازہ شمارے میں ایک مضمون لکھا جس میں ہاجرہ اور ظہیر کو داد دی گئی کہ وہ Personal تعصبات سے بلند ہو گئے اور سب لوگ ان کی تعریف کرتے رہے۔ میں نے یہ مضمون پڑھ کر ہاجرہ کو 'مبارکباد' بھجوادی ہے۔''

پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین اپنے قیام سے اپنے اختتام تک احمد ندیم قاسمی کی قیادت میں سرگرم عمل رہی تھی۔ انجمن کے سیکرٹری جنرل کے فرائض سرانجام دینے کے دوران بھی کبھی کبھار مارکسی نظریہ سازوں کی جانب سے احمد ندیم قاسمی کی مارکسی تعلیمات کے مطابق تربیت کی مساعی عمل میں آتی رہیں مگر وہ اشتراکی ہمہ اُوست پر ایمان لانے کے بجائے اپنے روحانی اشتراکیت کے اسلامی مسلک پر قائم رہے۔ انجمن کے تنظیمی طور پر بکھر کر رہ جانے کے بعد بہت جلد وہ وقت آ پہنچا تھا جب بین الاقوامی مارکسزم رُوس نواز اور چین نواز دو مختلف کیمپوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ اسی تبدیلی کے زیرِ اثر ایفرو ایشین رائٹرز کی تنظیم بھی رُوس نواز اور چین نواز ادیبوں کی دو الگ الگ تنظیموں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ احمد ندیم قاسمی پاکستان میں چین نواز ادیبوں کی افریشیائی تنظیم کے سربراہ تھے۔ لندن اور بعدازاں پاکستان میں ترقی پسندوں کی تقریبات پر ماسکو اور ماسکو نواز ادیب چھائے رہے تھے۔ شاید اسی باعث ان تقریبات میں احمد ندیم قاسمی کی قائدانہ حیثیت کو عملاً تسلیم نہیں کیا گیا۔ اسلام کی حقیقی روح سے پھوٹنے والی روحانی اشتراکیت ہمیشہ احمد ندیم قاسمی کا مسلک رہی ہے۔ یہ مسلک انجمن ترقی پسند مصنفین کے مارکسی دانشوروں کے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں رہا۔ ابھی حال ہی میں عابد حسن منٹو نے مشہور کسان لیڈر کامریڈ چوہدری فتح محمد کی کتاب ''جو ہم پہ گزری'' کے خیر مقدم میں لکھا ہے کہ:

''میرا اور چوہدری صاحب کا اور ہمارے تمام ساتھیوں کا یہ موقف رہا ہے کہ بائیں بازو کی وہی سیاست جس کی بنیاد مارکسی طرزِ فکر پر قائم ہو، درست ہے۔''(۴)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عابد حسن منٹو کا یہ محاکمہ رُوسی صدر ولادی میر پُوٹن کے تازہ ترین اعتراف کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ صدر پُوٹن نے لینن کے فکر و عمل کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ لینن کی قیادت میں سوویت یونین کی تعمیر میں مضمر خرابیوں کے اعتراف میں برملا اعلان کیا ہے کہ لینن نے اپنی حکمتِ عملی سے سوویت یونین کی بنیادوں میں ایک ٹائم بم نصب کر دیا تھا:

"Putin denounced Lenin and his government for brutally executing Russia's last czar along with all his family and servants, killing thousands of priests and placing a 'time bomb' under the

Russian state by drawing administrative borders along ethnic lines."(5)

روس کے صدر پوتن کے اس اعتراف حقیقت سے کہیں پہلے ، بہت پہلے احمد ندیم قاسمی کے ہاں روحانی اشتراکیت کا وہ تصور جو اسلام کی نفی نہیں بلکہ اسلام کے اثبات سے پھوٹا ہے رو بہ عمل تھا۔ اپنے تقلید پرست کمیونسٹ ساتھیوں سے احمد ندیم قاسمی کا یہی اختلاف نظر دوری کا سبب بن گیا تھا۔ چند کمیونسٹ نظریہ سازوں سے اس نظریاتی اختلاف کے باوجود انجمن کے ختم ہو کر رہ جانے کے بعد بھی ترقی پسند ادبی تحریک احمد ندیم قاسمی کے فیضان سے ہی سرسبز و شاداب رہی!

◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆ ◆

حواشی

۱۔ میرے پاس محفوظ، یہ تمام غیر مطبوعہ خطوط، عزیزی ڈاکٹر ناہید قاسمی کا عطیہ ہیں۔

۲۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر (مرتبین)، پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ارتضیٰ کریم۔ مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء

۳۔ مکمل دستاویز کے لیے دیکھیے:

Document: PWA Jubilee Declaration, Weekly 'Viewpoint', Lahore, October 18,1985. Pp.29, 30, 31.

۴۔ جو ہم پہ گزری، کامریڈ چوہدری فتح محمد، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، صفحہ ۱۸

5. Daily "DAWN", January 26, 2016.

باب ہفتم

احمد ندیم قاسمی کا تنقیدی فیضان

احمد ندیم قاسمی نے اپنے تخلیقی وفور کے ساتھ ساتھ اپنے تنقیدی شعور سے بھی ہمارے عصری ادب کو ثروت مند بنانے میں قابلِ تحسین خدمات سرانجام دی ہیں۔ فوجی آمریت کے ادوار میں جب زندگی اور فن کے ترقی پسند مسلک پر انتہائی کڑا وقت آن پڑا تھا اور ہماری ادبی دُنیا میں ماضی کی مخالفت، لفظ کی موت، بے معنویت اور لایعنیت کی تحسین کا چلن عام ہو گیا تھا اور ترقی پسند ادبی مسلک کی مذمت سکہ رائج الوقت بن کر رہ گئی تھی تب احمد ندیم قاسمی اپنی تنقیدی تحریروں سے ترقی پسند مسلک کی راہیں روشن کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہماری قومی تاریخ کے انتہائی سفاک دورِ جبر و استبداد میں فیض احمد فیض سے احمد فراز تک درجنوں ادیب اور شاعر خود اختیار کردہ جلاوطنی پر مجبور ہو کر رہ گئے تھے تب احمد ندیم قاسمی نے اپنے وطنِ عزیز کے اندر رہ کر حق گوئی اور بیباکی کا فریضہ ادا کیا تھا۔ اسی تاریک دور کی ایک اہلِ قلم کانفرنس میں احمد ندیم قاسمی نے آمرِ مطلق جنرل ضیاء الحق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلان کیا تھا کہ:

> ''ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ ہم صرف اپنی مملکت اور اہلِ مملکت کے ترجمان ہیں۔ ..... ہم ادیب جب اپنی مملکت سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں تو دراصل اس مملکت کے عوام، اس مملکت کی نظریاتی انفرادیت، اس مملکت کی تہذیب اور اس مملکت کی ہر خوبصورتی سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اور اس وفاداری میں حکومت سے وفاداری کا کوئی دور دراز کا بھی شائبہ نہیں ہوتا، کیونکہ حکومت کی مثال تو ریل گاڑی کو کھینچنے والے انجن کی سی ہے جس میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے بدل دیا جاتا ہے اور ریل گاڑی کا سفر جاری رہتا ہے۔ .... دریا کی راہ میں جگہ جگہ ابھارے جا رہے ہیں مگر دریا کو اپنی روانی سے کام ہے اور یہ پوری قوت سے رواں دواں ہے۔''(۱)

جب چند سکہ بند مارکسی عناصر نے اُن پر اہلِ قلم کانفرنس میں شرکت اور کانفرنس میں درج بالا خطبہ پیش کرنے پر اعتراض کیا تو اُنھوں نے دوٹوک جواب دیا کہ:

''میرے بعض ترقی پسند احباب مجھ سے شاکی ہیں کہ اوّل، میں نعتیں لکھتا ہوں۔ میرے پاس اس اعتراض کا صرف یہ جواب ہے کہ جی ہاں، لکھتا ہوں۔ دوم یہ اعتراض ہے کہ میں نے ادیبوں کی ان دو ''سرکاری'' کانفرنسوں میں کیوں شرکت کی۔ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ گھروں میں گھس بیٹھنے سے حکومتوں کی دست درازیوں کے راز فاش نہیں کیے جا سکتے۔ میں نے مارشل لا ءحکومت پر حقیقت افروز تنقید کر کے ثابت کر دیا کہ اعلانِ حق پر اہلِ قلم کا پختہ ایمان ہے اور آمریت کی کوئی بھی صورت ہمارے قلم اور ہمارے ضمیر کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ میں نے گھر بیٹھے رہنے کے بجائے، مارشل لاء کی سجائی ہوئی سٹیج پر جا کر مارشل لاء والوں کو کھری کھری سنائیں۔ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کا اعلان کرنے کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی مجھ میں فیاضانہ طور پر ودیعت کر رکھی ہے۔ اگر اعلانِ حق گناہ ہے تو میں یقیناً گنہگار ہوں اور میں اس گنہگاری کا برسرِ عام اعتراف کرتا ہوں۔'' (۲)

ضیاء آمریت کے اِس دور میں احمد ندیم قاسمی نے زندگی اور ادب کے ترقی پسند مسلک کی مذمت اور نفی میں لکھی جانے والی ہر تحریر پر گہری تجزیاتی نگاہ ڈالی اور یوں تہذیب و فن کی ترقی پسند روایات کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے مضمون ''عجزِ اظہار یا عجزِ فہم'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو ہمارے ادب میں ابہام اور لایعنیت اور انسانی زندگی کی بے معنویت وغیرہ کے تصورات نے راہ پائی ہے تو یہ دراصل مغرب کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے جس کے دم سے وہ (مشرق کے جسم پر اپنی گرفت کے ڈھیلا ہونے کے بعد) مشرق کی روح میں اپنے سامراجی پنجے گاڑنے کے درپے ہیں۔ میرا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ ابہام و بے معنویت کے رسیا فن کار اس سازش میں شعوری طور پر شریک ہیں۔ میرا مفہوم محض یہ ہے کہ وہ غیر شعوری طور پر (محض اپنی کاہلی اور ذہنی آسودگی پسندی کی بنا پر) مغربی فنون کی اس تحریک سے متاثر ہو رہے ہیں جو انسان کو کیڑے مکوڑے کی سطح پر اتار لائی ہے۔'' (۳)

ایسے میں ندیم نے نئے ادبی نظریات کے پردے میں پوشیدہ سامراجی مقاصد کی نشاندہی بھی کی اور اِن سامراجی ادبی نظریات کی اپنے ترقی پسند استدلال سے تردید و تکذیب کا کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے۔ اپنے مضمون ''زندگی افروزی کی روایت'' میں ترقی پسند ادبی مسلک کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ: ''ترقی پسندی تو محض ایک اصطلاح ہے اور اس کا مفہوم صرف اتنا سا ہے کہ ادیب، ادب کے جملہ تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر، زندگی پر تنقید بھی کرے اور اس کی تطہیر بھی کرے۔ میں اسلام کو بھی تنقیدِ حیات اور تطہیرِ حیات کا ایک نہایت مؤثر ذریعہ سمجھتا ہوں اس لیے اگر کوئی ادیب اسلامی

نقطہ نظر سے مروجہ نظامِ حیات کی بے انصافیوں پر تنقید کرتا ہے اور اکتنازِ زر کی مخالفت کرتا ہے اور معاشی مساوات نہ سہی، معاشی عدل و توازن کی دہائی دیتا ہے اور انسانی محنت کا استحصال کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے اور اپنی قوم کے ایک ایک فرد کو احتیاج سے آزاد اور خوش حال دیکھنا چاہتا ہے تو وہ صد فی صد ترقی پسند ہے۔ ترقی پسند کا قبالہ صرف کمیونسٹ ہی اپنے نام نہیں لکھوا لائے ہیں۔ ترقی پسندی تو ہر دیانت دار اور باضمیر ادیب کا اثاثہ ہے۔''(۴) اپنے مضمون ''تنقید میں دیانت'' میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''یقیناً ترقی پسند مصنفین سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض یقیناً فاش غلطیاں تھیں مگر غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں؟ جب ۱۹۵۲ء کی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ کراچی میں ترقی پسندوں نے وہ قرارداد واپس لی جس میں غیر ترقی پسندوں کے مکمل بائیکاٹ کا اعلان تھا اور ساتھ ہی اپنی اس غلطی کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ خود میری مثال موجود ہے کہ میں ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود ترقی پسند ادیب رہا اور اب تک ہوں اور مجھے ترقی پسند ادیب کہلانے پر فخر ہے۔ یقیناً ترقی پسند ادیبوں میں بعض عناصر ایسے بھی تھے جو مجھ ایسے لوگوں کی مذہبیت کو ناپسند کرتے تھے۔''(۵)

پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور سوویت رائٹرز یونین کی کورانہ تقلید میں انتہا پسندی کی جو روش اپنائی گئی تھی اُس کے زیرِ اثر اُن سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں پر ترقی پسند رسائل و جرائد کے دروازے بند کر دینے کی حکمتِ عملی درحقیقت رُوس میں جوزف سٹالن کے دورِ استبداد میں اینا اخمد ووا، اور مایاکوفسکی کے سے سربرآوردہ شاعروں اور ادیبوں کے مقاطعہ کی حکمتِ عملی کی کورانہ تقلید تھی۔ خوش نصیبی سے انجمن کے کارپردازان نے اپنی اس روش کے خطرناک ادبی اور تہذیبی اثرات سے سبق سیکھنے میں دیر نہ لگائی اور یوں انجمن کے اگلے کنونشن میں اس حکمتِ عملی کو ترک کر دیا تھا۔ اس کے باوجود انجمن ترقی پسند مصنفین چند برس کے اندر اندر سرکاری تعزیر و احتساب کے نتیجے میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ تنظیم ختم ہونے کے بعد بھی ترقی پسند نظریۂ ادب اُسی طرح زندہ اور فعال رہا جس طرح تنظیم کے وجود میں آنے سے پہلے تھا۔ احمد ندیم قاسمی اس نظریے کے سب سے بڑے داعی، مفسر اور مجتہد بن کر اُبھرے اور یوں اُنھوں نے اُردو ادیبوں کی کم و بیش تین نسلوں کی ادبی اور تہذیبی تربیت کا فریضہ سرانجام دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ ہماری قومی آزادی کو درپیش خطرات کی بروقت نشاندہی کرنے میں مصروف رہے:

''حصولِ آزادی یقیناً بہت بڑا مقصد ہے مگر اس آزادی کا تحفظ اس سے بھی بڑا مقصد ہے اور پاکستان کی آزادی کے تحفظ کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ہم نظریۂ پاکستان کا تحفظ کریں۔ ملکی آبادی کو اقتصادی لحاظ سے خوش حال بنائیں کہ ہم نے اپنی تہذیبی انفرادیت ہی کے تحفظ کے

لیے پاکستان حاصل کیا تھا اور برصغیر کی واحد تہذیب کا پرچار دراصل نظریہ، پاکستان کی نفی اور پاکستان کی روحانی سرحدوں پر چھاپا ہے۔''(۶)

وہ ادیبوں کی نئی نسل کو اُن ادبی اور تہذیبی خطرات سے مسلسل اور متواتر آگاہ کرتے رہے جو ادب میں لایعنیت، بے معنویت اور ذات کی گمشدگی کے مغربی ادبی فیشن کی کورانہ تقلید سے جنم لے رہے تھے:

''مغرب سے استفادے میں قطعی کوئی قباحت نہیں ہے مگر ہم بیشتر ایسے نظریات درآمد کرنے لگے تھے جو ہمیں ادیب کی معاشرتی اور ملکی اور انسانی ذمہ داریوں سے چھٹکارا دلا دیں اور ہمیں خود اپنی ہی ذات کے خول میں اس سختی سے مقید کر دیں کہ اس ذات سے الگ پورے عالم انسانیت کے ساتھ ہمارا رشتہ یا ہمارا تعارف ختم ہو جائے۔ ایک آزاد قوم کے افراد میں جب لایعنیت اور بے معنویت کے تصورات مقبول ہونے لگیں تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان افراد کو ان ذمہ داریوں سے خوف آتا ہے جو انسانی معاشرے کے صدیوں پر پھیلے ہوئے ارتقائی سفر نے ان پر عائد کی ہیں۔ یوں آزادی کی لگن بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور تحریکِ آزادی جسے، آزادی کے بعد دگنی شدت سے جاری رہنا چاہیے، انتشار اور بے عملی کی نذر ہو جاتی ہے۔ پھر ہمیں ان تصورات میں بڑی جاذبیت محسوس ہونے لگتی ہے جو ہمیں اپنے قومی وجود کے اثبات سے روکتے ہیں اور یوں ہمیں کومٹ منٹ کی آزمائش سے بچاتے ہیں۔''(۷)

زندگی اور فن میں مقصدیت کی نفی کے اِس منفی رجحان کو اپنے مضمون ''عجزِ اظہار یا عجزِ فہم'' میں یوں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

''ادب میں ابلاغ اور ترسیل کا مسئلہ نیا نہ سہی مگر ان دونوں میں جو شدت پیدا ہوئی ہے اس کی مثال ادب کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ بعض تو ادب میں ابلاغ و ترسیل کو ضروری ہی نہیں سمجھتے۔ متذکرہ عناصر آج کی بحث سے خارج ہیں۔ وہ تو اس انتہا تک جا چکے ہیں کہ اگر کوئی شعر یا افسانہ خود ان کی سمجھ میں آ جاتا ہے تو ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں کہ یہ کیسا جاہل اور قدامت پسند (بلکہ ترقی پسند) ادیب ہے کہ اس کی بات فوراً سمجھ میں آ گئی ہے۔ ان حضرات میں سے بعض کا یہ ارشاد بھی ہے کہ اگر مفہوم قاری کی سمجھ میں آ جائے تو اس کے اندر تجسس کا جذبہ مر جاتا ہے........ حالانکہ مثبت تجسس وہی ہے جو قاری کے ذہن میں شعر و افسانہ کے معنی و مفہوم کے ادراک سے پیدا ہوتا ہے۔''(۸)

اُس زمانے میں ہماری ادبی دنیا میں ادب و فن میں معنی و مفہوم کی اہمیت سے انکار ایک فیشن بن چکا تھا۔ اس

مروجہ ادبی فیشن کے مضمرات کو اپنے مضمون ''ادب اور افادیت'' میں زیر بحث لاتے ہیں اور اِس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کی سی ہونہار ادبی شخصیت کی جانب سے ادب میں افادیت سے بیزاری کے اثرات و نتائج کا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی شروع شروع میں تو ادب میں مقصدیت اور تعمیری معنویت کے قائل تھے مگر یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران امریکی طرز فکر سے متاثر ہوئے اور اس تاثر نے انہیں فرانسیسی علامت نگاروں تک اور ان کے واسطے سے دیگر ایسے شاعروں، ادیبوں اور ادب کے نقادوں تک پہنچایا جو افادیت سے خائف اور معنویت سے مشوش تھے اور مکمل عافیت کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے...... فاروقی صاحب کا ارشاد ہے کہ مقصدیت اور تعمیریت سے برگشتگی نے انھیں یہ فائدہ پہنچایا کہ انھوں نے اپنے سارے تعصبات ترک کر دیئے مگر یہ کتنا ظلم ہے کہ فاروقی صاحب کو اس صورتِ حال میں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ترکِ تعصبات کے اس عمل میں وہ ایک بہت بڑے تعصب کے چنگل میں جا پھنسے ہیں۔ یہ اظہار صداقت اور اظہار حقیقت کے خلاف تعصب ہے۔ فن میں افادیت کا مفہوم یہ ہے کہ فن کار سچ بولنے اور حق کہنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لے۔ یوں جو حضرات فن میں افادیت سے انکار کرتے ہیں، وہ بالواسطہ طور پر صداقت اور حقیقت کے اظہار سے بھی انکار کرتے ہیں اور شاید اسی لیے بے معنویت میں پناہ ڈھونڈتے ہیں پھر جو فنکار ادب و شعر میں صداقت اور حقیقت کی ایک جھلک دیکھتے ہی ادب کی موت اور شعر کی وفات کا فیصلہ سُنا دے اس سے بڑا متعصب اور کون ہوگا؟ ''(۹)

اِن حیات کش فنی ادبی نظریات کی تردید کے ساتھ ساتھ ندیم نے ہماری اپنی ادبی اور تہذیبی روایت کے دو درخشندہ ستاروں کو دھندلانے کی مساعی کو بھی اپنے ترقی پسند استدلال سے ناکام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُنھوں نے غالب فراموشی اور اقبال شکنی کے عزائم بھی خاک میں ملا کر رکھ دیے تھے۔ اُن کے مجموعہ مضامین ''پسِ الفاظ'' میں غالب پر ۹ مضامین اور دوسرے مجموعہ مضامین ''معنی کی تلاش میں'' اتنے ہی مضامین اقبال کے فکر و فن پر شامل ہیں۔ ندیم نے ہماری غالب فراموشی کے اسباب و نتائج پر بلند آواز سے سوچنے کا عمل شروع کر کے اپنے معاصرین کو اس ذہنی افلاس کے خوفناک تہذیبی اثرات کی جانب انتہائی مؤثر انداز میں متوجہ کر کے غالب شناسی کی روایت کو تازہ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اُنھوں نے بڑے مؤثر استدلال کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ:

''غالب ہمارا شاعر ہے کیونکہ وہ اس تہذیب کا ایک بلیغ نمائندہ تھا جس کے تحفظ اور نکھار کے لیے ہم نے برصغیر میں ایک الگ آزاد مملکت قائم کی تھی۔''(۱۰)

ندیم نے جس جذبہ و تعمیر کے ساتھ ہمارے تہذیب و فن کی قلمرو میں غالب کی عصری معنویت اُجاگر کی ہے اُسی

جذبہ محرکہ کے ساتھ اقبال کی فکر کے ساتھ اپنی اٹوٹ وابستگی کی اہمیت واضح کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے قیامِ پاکستان کے جلو میں منظرِ عام پر آنے والے اپنے مجموعہ کلام ''جلال و جمال'' کے ابتدائیہ بعنوان 'میرا فنی نظریہ' میں بڑے فخریہ انداز میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں ''بچپن سے اقبال کی شاعری سے اُنس پیدا ہوا جو اب تک اسی شدت سے قائم ہے۔''(۱۱) مزید یہ کہ ''میں نے جو کچھ کہا وہ احساس کی اس خاص رو سے مجبور ہو کر کہا جسے ''روحانی نغمگی'' سے بہتر نام نہیں دیا جا سکتا..... مذہبی رنگ کی شاعری مولانا ظفر علی خان اور پھر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کی بازگشت تھی۔ اسلامی لٹریچر بہت وسیع ہے اور مجھے اس کے گہرے مطالعہ کے وافر مواقع نہیں ملے۔ اس لیے میں اس صنف میں کسی نوع کی انفرادیت نہ پیدا کر سکا۔ مگر آئندہ چل کر اس رنگ میں نہایت بھرپور انداز میں لکھنا میری عزیز تمناؤں میں شامل ہے اور کیا عجب ہے کہ میں اسلام کو ایک آفاقی نظامِ حیات کی صورت میں اپنی نظموں میں پیش کر سکوں۔''(۱۲) ستم ظریفی یہ ہے کہ اِدھر ''جلال و جمال'' اشاعت پذیر ہوئی اور اُدھر احمد ندیم قاسمی مارکسی مُلّائیت کے علمبردار نظریہ سازوں کے نرغے میں آ گئے۔ سیّد سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین وغیرھم کی نظریاتی تلقین و تبلیغ کے زیرِ اثر ندیم صاحب نے ''اقبال شکنی'' کی مارکسی جنگ و جدل میں شمولیت اختیار کر لی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ رُکنیت اختیار کرنے سے پیشتر ہی انھوں نے اپنے مضمون بعنوان ''ترقی پسند مصنفین اور معترضین'' میں اقبال پر پہلا پتھر پھینک دیا: ''ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں اور اقبال کا مردِ مومن کا تصور پتھر پر لکیر نہیں بن گیا کہ پاکستان کے لیے ایک نیم فسطائی حکومت کا جواز پیدا کیا جائے۔''(۱۳) ہر چند علامہ اقبال پر احمد ندیم قاسمی کی یہ سنگ باری فقط چند سال جاری رہی اور وہ بہت جلد مارکسیت کی نظریاتی تربیت گاہ سے اُٹھ کر تہذیب و فن کی کھلی فضا میں آ نکلے تھے، تاہم اس سے اقبال کا تو کچھ نہ بگڑا، اُلٹا ندیم کے فکر و فن کو بہت گہری چوٹیں آئیں۔ یہ ہمارے ادب و فن اور ہماری تہذیب و ثقافت کی خوش بختی ہے کہ ندیم بہت جلد مذہبی مُلّائیت اور مارکسی مُلّائیت ہر دو کے چنگل سے آزاد ہو کر پھر سے مجلسِ اقبال میں آ وارد ہوئے اور انھوں نے اقبال کے فکر و فن اور اقبال کے سیاسی کارناموں کی تحسین سے ہمارے ادبی آفاق کو منور کرنا شروع کر دیا۔ تنقیدی مضامین پر مشتمل اُن کی کتاب ''معنی کی تلاش'' میں اقبال کی تحسین میں سات مقالات پر مشتمل ایک سلسلہ مضامین شامل ہے۔ اِن میں سے پہلے مضمون کا عنوان ہے: ''اقبال کے ساتھ انصاف کیجیے''۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خود ندیم نے اِن مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے سارے کے سارے مضامین میں اقبال کے ساتھ انصاف کرنے کا حق ادا کیا ہے۔ اپنے مضمون ''عہد ساز اقبال'' میں اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ''جس عہد میں ہم زندہ ہیں وہ اقبال کا عہد ہے اور یہ عہد صرف پاکستان تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے کرہ ارض پر محیط ہے۔ اس زمین کا ہر وہ مقام جہاں حق و انصاف کی جدوجہد ہو رہی ہے، جہاں سامراج سے نمٹا جا رہا ہے، جہاں محکومی کی زنجیریں توڑی جا رہی ہیں، جہاں

قوموں کی انا جاگ اٹھی ہے اور جہاں عظمت وجلال اور استقامت وصلابت کے درس دیئے جا رہے ہیں، اقبال کے اس عہد کی حدود میں شامل ہے۔''(۱۴)

احمد ندیم قاسمی اقبال کی اسلامیت کو آفاقیت قرار دیتے وقت اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ:

''علامہ اقبال کا فلسفہ دل ودماغ کی بے پناہ توانائیوں کے درواکر دینے کا فلسفہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ان توانائیوں کا اصلی منبع اسلام ہے، قرآن ہے اور اسوہء رسول صلعم ہے۔ اس کے باوجود اس فلسفے میں ساری دنیا کو عملی شرکت کی دعوتِ عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال ''پین اسلامزم'' کو اپنی آخری عالمگیر صورت میں ''پین ہیومنزم'' قرار دیتے ہیں۔''(۱۵)

قیامِ پاکستان کے آس پاس کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اقبال کو برصغیر میں کمیونزم کے فروغ واستحکام میں سب سے بڑی رُکاوٹ سمجھتی تھی۔ اشتراکی نظریہ سازوں کو سب سے بڑا خطرہ اسلام کی حیاتِ نو سے متعلق اقبال کے جدید تصورات کی اثر انگیزی سے تھا۔ اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے بھی مارکسی مُلاؤں کے زیرِ اثر اقبال کی احیائیت پسندی کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ خوش نصیبی سے تقلید پرستی کا یہ وقفہ وزماں بہت مختصر ثابت ہوا اور ندیم صاحب بہت جلد پورے کے پورے اقبال کی تلقین وتاثیر کو پھر سے انتہائی مبارک قرار دینے لگے۔ چنانچہ اُن کا مضمون ''پورا اقبال'' درج ذیل سطور پر تمام ہوتا ہے:

''اقبال ہماری تاریخِ آزادی اور ہماری تحریکِ احیائے اسلام کے سلسلے کی وہ اہم کڑی ہیں کہ جو ماضی کو نہ صرف حال سے بلکہ مستقبل سے بھی ملاتی ہے، جو نظریے کی کڑی کو عمل کی کڑی سے مربوط کرتی ہے، جو خواب اور حقیقت کے درمیان مثبت رشتہ پیدا کرتی ہے...... اور یہ کڑی وہ پوری شخصیت ہے جس کا نام علامہ اقبال ہے...... جو شاعر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، سیاست شناس بھی ہیں۔ اپنے دور، اپنے ملک اور اپنی قوم کے نباض بھی ہیں اور جو انسان کو اس سے چھنا ہوا وقار واپس دلانا چاہتے ہیں اور جو احترام آدمیت کو آدمیت قرار دیتے ہیں اور جنھیں آزادی، اولوالعزمی، جدوجہد، جستجو اور عدل سے محبت ہے اور جو محکومی، انفعالیت، شکست خوردگی، تقدیر پرستی اور بے انصافی سے نفرت کرتے ہیں۔''(۱۶)

احیائے اسلام کی تحریک کو سامراجیت کے زائیدہ وتمام تر امراض کا شافی علاج قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیّد جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ اسلامی ممالک بے شک اپنی جغرافیائی اور ثقافتی انفرادیتیں برقرار رکھیں مگر ان سب ملکوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے اور ان بکھرے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کو ایک ملت بنانے کے لیے مجلسِ اقوام کے انداز کی ایک مجلسِ ممالکِ اسلامیہ وجود میں آئے جس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یک جہتی، ہم آہنگی، باہمی تعاون اور بھائی چارے کا منشور دیا جائے اور یہ منشور اول وآخر قرآن مجید کے احکام مقدسہ اور حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی پر مشتمل ہو۔ جب تمام دنیا کے

مسلمانوں کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے، شریعت ایک ہے، منتہائے نظر ایک ہے تو سیاسیات اور معاشیات میں ان کا ایک رُخ کیوں معین نہ ہو۔ صرف اسی صورت میں مسلمانوں کا مستقبل بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور کرہ ارض پر پھیلتی ہوئی احیائے اسلام کی تحریک بھی کسی مثبت نتیجے تک پہنچ سکتی ہے اور بڑی عالمی طاقتوں کی روندی ہوئی اس دنیا میں امن، سلامتی، خوش حالی، عدل، مساوات، محبت اور اخوت کی ابدی فضا بھی قائم ہو سکتی ہے۔"(۱۷)

ایک ایسے زمانے میں جب ہمارے ہاں ادبی تنقید مدرس نقادوں کی گرفت میں تھی۔ درسی تنقید نے ہمارے ماضی کے ادبی ورثے کی تحسین وتردید اور مغربی ادب کے مختلف اور متنوع رجحانات کے تعارف و تجزیہ کے فرائض تو خوب ادا کیے مگر اُسے پاکستانی ادب کے عصری رجحانات کی جانب توجہ دینے کا خاطر خواہ وقت نہ مل سکا۔ ہمارے نقادوں کی اس عدیم الفرصتی کی تلافی احمد ندیم قاسمی نے اس شان سے کی کہ ہمارے ادب کی غالب اور اقبال تک پہنچتی ہوئی اور اقبال کے ہاں نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہوئی ادبی روایت فروغ وارتقا کی نئی منازل طے کرتی چلی گئی!

◆◆◆◆◆◆◆

حواشی

۱۔ پس الفاظ، احمد ندیم قاسمی، لاہور، ۲۰۰۳ء، صفحات ۲۵، ۲۷، ۱۵۵

۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۹

۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۷

۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۵۵

۵۔ ایضاً، صفحات ۱۸۷۔۱۸۸

۶۔ ایضاً، صفحات ۲۳۰۔۲۳۱

۷۔ ایضاً، صفحات ۶۸۔۶۹

۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۲

۹۔ ایضاً، صفحات ۲۳۵ تا ۲۳۷

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۳۴

۱۱۔ میرا فنی نظریہ، جلال و جمال، احمد ندیم قاسمی، لاہور، ستمبر ۱۹۴۶ء۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ماہنامہ نقوش (۹، ۱۹۴۹ء)، لاہور، صفحہ ۵۔

۱۴۔ معنی کی تلاش، احمد ندیم قاسمی، لاہور، ۲۰۰۳ء، صفحہ ۳۲

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۳

۱۶۔ ایضاً، تحریکِ آزادی۔ ادب اور ادیب، صفحہ ۲۱۳

۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۱۴

ضمیمہ جات

۱۔ ڈاکٹر تاثیر کا خط، مولانا سالک کے نام
۲۔ تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور پاکستانی ادیب
۳۔ پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے نام
۴۔ اقبال کے خلاف چارج شیٹ
۵۔ ایک نیا شوشہ
۶۔ انجمن کا پہلا منشور
۷۔ نیا منشور
۸۔ انجمن کے احیاء کے بارے میں استفسار

ضمیمہ ا

ادب میں ترقی پسندی اوراشتراکیت

ڈاکٹر تاثیر کا خط مولانا سالک کے نام

برادرم سالک! تسلیمات

کیا "افکار و حوادث" کی آگ اتنی ٹھنڈی پڑ گئی کہ دوست ایندھن کے کام آنے لگے! زہے قسمت کسی کام تو آئے!

بھائی! آپ ترقی پسندی کی بحث میں کیوں پڑ گئے! اور پھر اشتراکیوں کے متعلق تو یہ حسن ظن کہ ان سے پوچھے بغیر، ان کے بیانات کے ہوتے ہوئے، آپ میری رائے سے اتفاق نہیں کرتے لیکن مجھ پر مجھ سے پوچھے بغیر ہر طرح کی تہمت تراش رہے ہیں۔ آپ تو سچ مچ ترقی پسند ہو گئے! سرکار سنیے:

(۱) ہر ترقی پسند اشتراکی نہیں۔

(۲) ہر ترقی پسند غدار نہیں۔

(۳) ہر اشتراکی غدار ہے اس لیے کہ:

(الف) وہ مملکت پاکستان کو ظالم و جابر سمجھتا ہے۔ ہر غیر اشتراکی مملکت کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔

(ب) روس سے جنگ کرنا بہر صورت ممنوع قرار دیتا ہے، خواہ پاکستان ہی حریف کیوں نہ ہو؟

(ج) کشمیر کے پاکستان سے ملنے کے خلاف ہے! اگر سول اخبار افواہ بازی پر غدار ہے، تو اشتراکی اس عقیدے کی بنا پر غدار کیوں نہیں؟

(۴) ترقی پسند ادیب بقول بھٹی صاحب (فنانشل سیکرٹری ترقی پسندان) اشتراکیوں کے ہاتھ میں ہے۔ "مئی" کے دن سجاد ظہیر سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی (جس کے قلم نے لکھا کہ کشمیر کو ضرور ہندوستان سے ملنا چاہیے) کو اس طرح نیلام کیا گیا جیسے کسی بڑے گرو کا قلم ہو۔ اس قسم کے رجحانات خطرناک ہیں۔

(۵) ترقی پسند ادیبوں کی تحریریں ہندوستان میں ہوں کہ پاکستان میں، ہمارے ملک کے مفاد کے

خلاف بے باک ہیں۔ ستم یہ ہے کہ ہندی ترقی پسند تو کشمیر کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لیے رضا کار ہیں، کرشن چندر اور ڈاکٹر ملک راج آنند بھی اور ہمارے ترقی پسند ابھی تک یہ بھی نہ کہیں کہ کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔ بلکہ مئی کے دن جن ادیبوں کو سراہیں، ان میں اسی کرشن چندر اور ملک راج آنند کے نام ہوں!

(۶) آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ غالباً ترقی پسندوں کے ممدوح ہیں۔ انھیں اشتراکیوں سے الگ کیجیے اور راہِ راست پر لائیے۔ آپ یقین جانیے سب لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ان اشتراکیوں کی بے راہ روی کی بدولت ترقی پسندی کا کاروبار خراب ہو رہا ہے۔ ظلم و تشدد کو بہانے مل رہے ہیں۔ ادیبوں میں افتراق پیدا ہو رہا ہے!

غدار اور بد مذہب اشتراکیوں کو الگ کیجیے اور ترقی پسندوں کی ایک صالح جماعت بنائیے! اور یہ نہیں ہو سکتا تو پھر اپنے نیاز مندوں پر سوء ظن نہ کیجیے!

آپ ان لوگوں کے فکر و فن سے آگاہ نہیں۔ آپ یقیناً ان کی تطہیر میں ناکام رہیں گے۔ اور جو کامیاب ہوئے۔ فھو مرادنا! چشم ما روشن دل ما شاد! بندہ تو ترقی پسندی اور اشتراکیت کو الگ الگ دیکھنا چاہتا ہے، اور یہی آپ کی بھی آرزو ہے، تو پھر آپ کو حیرت کس بات پر ہے!

دنیا بدل گئی، ملک آزاد ہو گیا اور یہ طوطے وہی پرانا سبق دہرا رہے ہیں کہ ہر بغاوت، ہر اعتبار سے، ہر رنگ میں اچھی ہے۔ آپ کی ایک صحافتی شوخی کی داد دیتا ہوں۔ میں نے بوضاحت کہا کہ ہر چند فیض صاحب نے کشمیر کے متعلق قرار داد تیار کی مگر اشتراکیوں نے دستخط نہ کیے۔ آپ میرے اس کہے کو نظر انداز فرماتے ہیں اور مجھی سے اس کا جواب طلب فرماتے ہیں! اشتراکیوں کے نزدیک کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی حمایت بے ایمانی تھی! بے ایمانی کا لفظ التزاماً استعمال کر رہا ہوں کیونکہ قلم کار سجاد ظہیر نے تحریر فرمایا کہ ہر ایماندار شخص کا فرض ہے کہ وہ کشمیر کو ہندوستان سے ملانے کی کوشش کرے! اشتراکی مہینوں بعد پھر ملے لیکن پاکستان کے حق میں پھر بھی نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک آج تک پاکستان ناقابل تسلیم.....
آپ مجھے کیوں لکھتے ہیں۔ آپ خود ان اشتراکیوں سے ترقی پسندوں کو نجات دلائیے!

(روزنامہ انقلاب، ۲۸ مئی ۱۹۴۹ء، لاہور)

ضمیمہ۲

تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور پاکستانی ادیب

۳ جون ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں کا درج ذیل بیان شائع ہوا تھا جس پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے صرف ایک رُکن، فیض احمد فیض نے دستخط کیے تھے۔ انجمن کے باقی تمام اراکین نے اس بیان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا:

PAKISTAN WRITERS' APPEAL FOR SUPPORT TO AZAD KASHMIR

A passionate appeal has been made by some of the top-ranking writers and artists of Pakistan which include such personalities as Sh Abdul Qadir, Professor A. A. Bokhari, Hafeez Jallunduri, Dr. Taseer, Faiz Ahmed Faiz and Abdul Rehman Chugtai, to their fellow-writers all over the world to join us in protesting against the wrongful deeds that are being committed in Kashmir by the rulers of Kashmir with the support of the India Government.

The following is the full text of the statement jointly issued by the progressive writers:

We the writers and artists of Pakistan appeal to all writers and artists wherever they may be, to join us in protesting against the wrongful deeds that are being committed in Kashmir by the rulers of Kashmir with the support of the India Government. Most of us who have signed this appeal are not

interested in politics as such but we feel it is our duty to arouse the conscience of our fellow-writers and artists because the values whose survival is necessary for the existence of all progressive literature and art, are in great danger and the fundamental issues involved in the Kashmir struggle have been obscured by political chicanery and propaganda.

Many years ago the British sold the land of Kashmir and its four million people to the ancestors of the present ruler who belongs to a small clan alien to and different from the vast majority of the population of Kashmir in language, race culture and religion.

MISERY, POVERTY AND FILTH

The rule of this clan has been notorious for its tyranny and oppression, and the people of Kashmir have lived in misery, poverty and filth. In the last thirty years there have been many attempts at mass rebellion. When the day of India's freedom drew near, the people of Kashmir once more prepared themselves to be rid of their bondage.

A free kashmir would choose either to become independent or to accede to Pakistan with whom it is geographically contiguouse and whose people have the same religion and share the same culture. This would not suit either the ruling house of Kashmir or the India Government and the two have therefore made common cause over the Kashmir issue.

THREE STEPS

To keep himself in power, the Maharaja of Kashmir has taken three steps. Firstly, he himself being a Hindu and the people of Kashmir being

overwhelmingly Muslim he has given the struggle a communal turn. Following a technique perfected in recent months by the Sikh chieftains of the Punjab, he is exterminating or driving out the Muslim population in large numbers and replacing it by Hindus and Sikhs from outside with the object of drastically changing the communal proportion in his favour.

Secondly he is using the armed support of the India Government to terrorise and annihilate the patriotic sections of the people.

Thirdly, he has bought over corrupt local politicians whom he is using to create disruption among the people.

As the first step, the Muslim population in some districts like Jammu were slaughtered wholesale. This had immediate repercussions in the neighbouring Muslim areas and a number of Pathan tribesmen joined the ranks of the State subjects who had already risen in rebellion.

This was used as a pretext for armed intervention by the India Government. A local political leader, Sheikh Abdullah, was hastily released from jail and armed with extraordinary emergency powers to put down the rebellion. This person who derives his authority entirly from the Maharaja and from the armed forces of the India Dominion, is publicised as the people's representative.

The people, have on the other hand set up their own Government the Azad (Free) Kashmir Government. The forces of the Azad Government are raised fed supplied and equipped from local sources and volunteers from many countries have joined them in their fight for freedom.

The Maharaja and the India Government would have the world believe that a war is going on between the patriots of Kashmir and foreign invaders.

Such a war is going on but the foreign invaders are armies of India who are bombing and machine-gunning the patriots of Kashmir.

UNEQUAL WAR

It is an unequal war with trained and well-equipped troops of India and Kashmir on one side and irregular guerilla bands of ill-equipped, half-starved peasantry on the other. There can be no doubt as to which side the sympathies of all those who love freedom and stand for justice and fair play should lie.

We condemn the actions of the Maharaja and his supporters within and without Kashmir and we send our greetings to the Azad Kashmir Government and assure them that whatever the outcome of their struggle, the part they are playing in it is the only one that a self-respecting people can play.

We appeal to all writers and artists to whichever race or country they may belong to join their voice with ours in support of the forces that are trying to defend the values and ideals for which all great writers and artists have striven, throughout the ages. (Pakistan Times, Lahore, Saturday, January 3, 1948, 20 Safar, 1367 A.H.)

ضمیمہ ۳

بات چیت
ظہیر کاشمیری

پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے نام

رفیقو! قیام پاکستان سے لے کر آج تک، یہاں کے سرکاری، نیم سرکاری اور رجعت پسند ادیبوں نے ہمارے آدرشی اتحاد اور تنظیمی سرگرمیوں پر طرح طرح کے ناروا حملے کیے، ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ ہماری سالمیت کو پارہ پارہ کرسکیں گے، ہم سے ہمارے قلم چھین سکیں گے اور ہماری جمہور نواز ادبی کاوشوں پر زنجیر ڈال سکیں گے...... لیکن آج ہمیں پوری طرح آزما چکنے کے بعد وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھوں نے ہماری طاقت اور ہمارے عزائم کا غلط اندازہ لگایا تھا، ہم نے خود اعتمادی، بلند حوصلگی اور یک رنگیٔ فکر سے ان کے تمام حملے پسپا کردیے ہیں اور آئندہ زیادہ مضبوطی سے مدافعت کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ڈاکٹر تاثیر نے ہمیں ایک خالص سیاسی میدان میں دعوتِ مبارزت دی، اس نے کشمیر کی جنگ کے بارے میں ہمارے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیج کر ہماری رائے طلب کی، ڈاکٹر تاثیر سمجھتا تھا کہ پاکستان کے ترقی پسند ادیب اس گشتی مراسلہ کے خلاف رائے دیں گے اور اس طرح ان کی تحریک رائے عامہ کی مخالفت کا شکار ہو کر خود بخود ختم ہو جائے گی...... ایک تو ہم مذکورہ مراسلہ کا پس منظر اور ڈاکٹر تاثیر کی نیت سے بخوبی واقف تھے اور دوسرے ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ ہم اسے آزاد کشمیر گورنمنٹ کا نمائندہ سمجھیں، اس لیے ہم نے مذکورہ مراسلہ کا جواب دینا مناسب ہی نہ سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر تاثیر کے ترکش کا زہریلا تیر ہمارے سینوں میں پیوست ہونے کے بجائے فضا کی پنہائیوں میں کہیں کھو کر رہ گیا۔

لیکن ہماری اس خاموشی کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ ہم مسئلہ کشمیر کے متعلق کوئی رائے ہی نہ رکھتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ اس قضیے کے متعلق ہم شروع ہی سے ایک واضح رائے رکھتے ہیں اور وہ رائے اتنی ڈھکی چھپی بھی نہیں۔ ہر وہ آدمی جو ہماری تحریک سے ذرا سا بھی متعارف ہے اسے بخوبی جانتا ہے۔

ہماری رائے میں برطانیہ یا امریکہ کے ثالثوں کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بین الاقوامی مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ جیسا چاہیں کر دیں۔ ہم کشمیر کے معاملہ میں انڈین یونین کے سامراجی عزائم سے نفرت کرتے ہیں، ہم تقسیم کشمیر کے مخالف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ پاکستان کی حکومت کشمیری عوام کو بہاول پور ایسی اصلاحات دے کر ٹرخا نہ دے...... ہمارے نزدیک کشمیر کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہاں عوامی حکومت قائم ہو کیونکہ کشمیری عوام ہی اپنے وطن کے مستقبل کے صحیح وارث ہیں۔ انھوں نے ہی کشمیر کی چٹانوں پر پھول اگائے، انھوں نے ہی ڈوگرہ آمروں کے کچوکے سہہ کر حسن کشمیر کو سنوارنے میں کبھی بھول نہ کی۔

جب تک کشمیری عوام اپنے وطن کے اندرونی ڈھانچے کی تعمیر اور نمائندہ حکومت کا انتخاب نہیں کرتے، جب تک انھیں پوری داخلی آزادی نصیب نہیں ہوتی، جب تک وہ کشمیر کی سیاسی طاقت کے پورے مالک نہیں بنتے، جب تک وہ اپنے وطن کی زرعی اور صنعتی طاقت کے پورے وارث تسلیم نہیں کیے جاتے، کشمیر میں سنہرے اور خوشحال زمانے کا آغاز نہیں ہو سکتا...... لیکن اگر یہ سب کچھ ہو جائے تو آج ہی کشمیر بیرونی اثرات سے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور برطانیہ اور امریکہ کے ثالث بستر باندھ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔

ہماری تحریک پر دوسرا حملہ محمد حسن عسکری کی طرف سے ہوا۔ عسکری نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہمیں ففتھ کالمسٹ اور دشمن پاکستان ثابت کرنے کی کوشش کی، اس وقت چونکہ عامۃ الناس میں خدمتِ پاکستان کا جذبہ، اپنے پورے عروج پر تھا اس لیے عسکری کا خیال تھا کہ وہ ملک دشمنی کے نعرے کی بنا پر، ترقی پسند مصنفین کی ساری تحریک کو عوام اور حکومت کے اشتعال کی آگ میں جلا کر بھسم کر سکے گا اور خود بلاشرکتِ غیرے پاکستان کا ''ادیب اعظم'' کہلانے لگے گا لیکن عسکری چونکہ سیاسی طور پر کند ذہن واقع ہوا ہے اس لیے وہ اپنی نیم سیاسی نگارشات میں خود ہی الجھ کر مضحکہ بن گیا، اس نے یہ تو کہہ دیا کہ ترقی پسند مصنفین پاکستان کے وفادار نہیں لیکن وہ یہ نہ سمجھا سکا کہ پاکستان سے اس کی کیا مراد ہے اور وفاداری کے سیاسی معنے کیا ہو سکتے ہیں...... اگر پاکستان سے عسکری کی مراد محض ایک خطہء زمین (Territory) ہے تو اس کی وفاداری زمانہء جہالت کی یادگار ہے۔ اس وقت وحشی صرف اپنے قبیلے کی زمین کو ہی نہیں بلکہ وہ ہر اس شے کو پوجتے تھے جو ان کی مادی ضروریات کو پورا کرنے میں ممد ثابت ہوتی تھی، خطہء زمین کی وفاداری کا یہی نعرہ مغربی ممالک نے اٹھارہویں صدی میں دوبارہ زندہ کیا اور اس کی مدد سے سرمایہ دار صدیوں تک اپنے عوام کا خون چوستے رہے اور انہیں شاہنشاہی مقاصد کے لیے توپوں کا ایندھن بناتے رہے...... ہم کسی خطہء زمین کی وفاداری کو ذہنی بت پرستی سمجھتے ہیں اور اس نعرے کو استحصال پرستوں کا مشہور حربہ تصور کرتے ہیں۔

اگر پاکستان سے عسکری کی مراد حکومتِ پاکستان ہے تو جب بھی اس کی وفاداری کلیہ نہیں بن سکتی، اگر آج حکومت پاکستان فاشی انداز اختیار کر لے، افراد کے بنیادی حقوق چھین لے اور جمہوری اداروں کو توڑ دے، تو یقیناً ہم اس

کے وفادار نہیں رہ سکیں گے، بلکہ اس کے خلاف ہمیں لڑنا ہوگا، اس کے خلاف رائے عامہ کو مضبوط بنانا ہوگا اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں لانا ہوگا جو صحیح معنوں میں جمہوری اور ترقی پسند ہو۔

...... اور اگر پاکستان سے عسکری کی مراد پاکستانی عوام ہیں تو ان کے ساتھ ہماری وفاداری تمام شبہات سے بالا ہے، ہماری تحریک کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ ہم کتابوں، رسالوں، پمفلٹوں، ریڈیو اور فلموں کے ذریعے ایسے علوم کی اشاعت کریں جس سے ہمارے عوام میں نئی زندگی اور نیا شعور پیدا ہو جس سے وہ اپنے فطرتی حقوق سے آگاہ ہو سکیں اور خود اعتمادی سے ملکی اور غیر ملکی اجارہ داروں سے سیاسی طاقت چھین سکیں ...... پاکستانی عوام ہی پاکستان کے معمار و محافظ ہیں، جب تک اصفہانیوں، حبیب بنکیوں، سندھ کے وڈیروں، پنجاب کے نوابوں، سرحد کے خانوں اور کشمیر کے ٹھاکروں کو اقتصادی طور پر ہموار نہیں کر دیا جاتا، پاکستان کے عوام ذہنی اور بدنی طور پر آزاد نہیں ہو سکتے ...... اور عوامی بہبودی کی خاطر ہم ایسا کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

ہماری تحریک پر تیسرا حملہ، بنگلوری ادیب صمد شاہین کی طرف سے ہوا، اس نے نیا دور (۱۴، ۱۵) کے حرفِ آغاز میں اردو ادب کی گذشتہ تمام ترقی پسند اور عظیم روایتوں کو منسوخ قرار دے کر ایک نئے مدرسہ ادب (پاکستانی ادب) کی داغ بیل ڈالنے کا دعوی کیا، صمد شاہین نے اس نئے مدرسہ ادب (پاکستانی ادب) کی کچھ اس طرح تشریح کی" ...... پاکستان کی نئے سرے سے تعمیر ہو رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک نئے ادب کی داغ بیل بھی ڈالنی چاہیے ...... ہمارے ادب میں ریاست سے وفاداری ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنی چاہیے ...... ہمارے ادب میں مذہبی تصورات کی آمیزش ہو جیسے ملٹن کے فردوس گم گشتہ میں تھی یا گوئٹے کے فاؤسٹ میں ...... ہمارے ادب میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے کلچر کی عکاسی ہو جیسے والٹر سکاٹ، ہارڈی اور آرنلڈ بینٹ نے کی ...... ہمارے ادب کو روسی اشتراکیت سے نفرت کرنا چاہیے اور پھر آرتھر کوسلر، آندرے ژید، میکس ایسٹ مین وغیرہ سرے سے بکتے تو نہیں، جب وہ کہتے ہیں کہ روس میں انقلاب دشمن برسر اقتدار ہیں۔"

دوسرے لفظوں میں صمد شاہین یہ کہنا چاہتا ہے ...... اشتراکی تصورات سے بچو، پاکستان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو عوام کا خون چوسنے دو، مذہبی صوفیت کا پرچار کر کے اونچے طبقوں کے سیاسی فراڈ پر پردہ ڈالو، پاکستان کو بورژوا ڈیموکریسی بناؤ، اور بین الاقوامی طور پر اینگلو امریکن بلاک کا ساتھ دیتے ہوئے مر جاؤ ...... صمد شاہین کے لیے سب سے بڑی حقیقت پاکستان (سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا پاکستان) ہے لیکن ترقی پسند ادیبوں کے لیے سب سے بڑی حقیقت پاکستانی عوام ہیں، صمد شاہین بین الاقوامی طور پر صالح اور جمہوری طاقتوں کو کچلنے کے لیے لندن اور نیویارک کے شائی لاکوں کا ساتھ دینا چاہتا ہے لیکن اگر وہ دیانتداری سے اپنے قومی اور ملی ہیروز کی لاشوں سے کفن سرکا کر دیکھے تو اسے آج بھی ان کے سینوں پر ان گولیوں کے نشان ملیں گے جو بزل گیٹ یا اوڈوائر کی رائفلوں سے نکلتی رہیں۔

صمد شاہین کو شاید یہ علم نہیں کہ تاریخی اعتبار سے بورژوا ڈیموکریسیوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، دنیا شہنشاہیت اور فاشیت سے گزر کر عوامی دور میں داخل ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی ادیب کا زاویہ فکر بھی بدل چکا ہے، آج کا ادیب سرمایہ داری سے نفرت کرتا ہے، سامراج کے انجر پنجر ڈھیلے کر رہا ہے اور ایک عالمگیر انسانی معاشرے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

ہماری تحریک پر چوتھا حملہ براہ راست حکومت کی طرف سے ہوا، 'سویرا'، 'نقوش' اور 'ادب لطیف' صرف اس جرم کی وجہ سے چھ ماہ کے لیے جبرا بند کر دیے گئے کہ وہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے ترجمان تھے عوام کی زبان تھے اور انسانی مسائل کو صحیح علوم کی روشنی میں دیکھنے کی دعوت دیتے تھے...... حکومت نے کئی ایک پرچوں سے اشاعت سے پہلے ہی نیک چلنی کی ضمانتیں طلب کر لیں صرف اس لیے کہ ان کے مالکوں یا مدیروں پر ترقی پسند ہونے کا اشتباہ تھا، ہماری تحریک پر پولیس کے پہرے بٹھا دیے گئے، فرداً فرداً ڈرایا دھمکایا گیا، لالچ دیے گئے اور عذابِ دوزخ کے ساتھ جیل کے عذاب سے بچنے کے مشورے دیے گئے۔

ڈاکٹر تاثیر، عسکری، صمد شاہین حکومت اور دیگر مخالفین جب یکے بعد دیگرے اپنی انفرادی کوششوں میں شکست کھا گئے، ہمارے صاف ذہنوں، مخلص جذبوں اور اٹل ارادوں کا مقابلہ نہ کر سکے تو رجعت پسندی کی ساری طاقتوں نے اجتماعی طور پر ہم پر آخری اور فیصلہ کن ہلہ بول دیا، ہم پر الزام لگایا گیا کہ ہم نے یوم مئی کی تقریب پر پیغمبر اسلام صلعم کی توہین کی ہے، ہم نے اس بہتان کی فوراً تردید کی، عوام کو یقین دلایا کہ ہم بحیثیت انجمن تمام دینی اور سیاسی بزرگوں کی عزت وتکریم کرتے ہیں جنھوں نے مختلف دوروں میں انسانیت کی صالح قدروں کی بقا کے لیے ہر ممکن قربانی دی لیکن چونکہ ہم پر جو الزام لگایا تھا، سوچی سمجھی پالیسی کا نتیجہ تھا، اس لیے ہمارے تردیدی بیان کے باوجود مخالفین بڑی شد و مد سے اپنے تخریبی مشن میں مصروف رہے۔

اخبارات میں ہمارے خلاف بڑی غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز تحریریں شائع کرائی گئیں، مسجدوں میں علمائے دین سے ہمارے قتل کے فتوے حاصل کیے گئے، ہمارے خلاف غنڈے آرگنائز کروائے گئے، ہمارے ہفتہ وار جلسوں کو بدنی قوت کے بل پر توڑنے کی عملی کارروائیاں کی گئیں اور اس طرح کراچی سے لاہور تک ہمارے خلاف خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا گیا، یہ حملہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عملی اور نتائج کے اعتبار سے کافی ہولناک تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہماری مخالف قوتیں بوکھلا کر اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئی ہیں۔ ہم نے اس حملہ کے انداز اور دائرہ اثر کو شروع ہی سے بھانپ لیا تھا اور ہم تہیہ کر چکے تھے کہ ترقی پسند تحریک کے تحفظ کے لیے اگر ہمیں خون دینے کی ضرورت بھی پڑی تو ہم ہرگز گریز نہ کریں گے، ہم اس حملہ کے سامنے لوہے کی دیوار بن گئے، ہم نے پامردی سے تحریک کی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھا حتی کہ رجعت پرستوں کے اس بہیمانہ اور وحشیانہ حملے کی شدت آہستہ آہستہ ختم ہوگئی (اس حملے کی سیاسی رپورٹ انجمن علیحدہ شائع

کر رہی ہے)۔

تہذیب کے محافظو! ہماری تحریک کا عبوری دور ختم ہو چکا، ہم معمولی جمعیت سے متشدد حریفوں اور نادری طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے پھیلاؤ اور قوت کے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے آدرش کی آواز پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے، ہم اپنے ملک کے ذہین طبقوں سے پوری طرح متعارف ہو چکے ہیں، وہ ہمارے تاریخی کارناموں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس ملک کی آزادی خوشحالی اور سنہرے مستقبل کے سلسلہ میں ہم سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں...... ان کے پیش نظر ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور ہم جدوجہد کے وسیع تر میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔

موجودہ حالات میں ہمیں اپنے تنظیمی شعور کو زیادہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ تنظیم ہی سے افراد میں قوت اور احساسِ قوت پیدا ہوتا ہے۔ تنظیم ہماری فرداً فرداً کوششوں کو یکجا کر کے ان میں Integrity پیدا کرے گی اور ہمارے عہد آفریں ارادوں کو موثر تر بنائے گی، آج کوئی رفیق تنظیم سے باہر نہ رہنا چاہیے، ہم ریڈیو میں کام کرتے ہوں یا فلمی دنیا میں، روزناموں میں کام کرتے ہوں یا پبلسٹی کے اداروں میں، ہمیں اپنی انجمن کی اکائیوں میں فوراً شامل ہو کر انہیں مضبوط بنانا چاہیے اور اگر مقامی اکائیاں موجود نہ ہوں تو انہیں تشکیل دے کر انجمن کے صوبائی مرکز سے رابطہ قائم کرنا چاہیے، انجمن کی طاقت ہماری طاقت ہے، ہماری طاقت پاکستان کے عوام کی طاقت ہے اور پاکستان کے عوام ہی تعمیر ملک کی آخری کڑی قرار پائیں گے، آج ہمارے چھوٹے چھوٹے کلچری اور فنی حلقے جنہیں ہم دماغ کی شریانوں کی گرمی اور دل کے خون سے سینچ رہے ہیں اگر یونہی تنظیمی طور پر مضبوط سے مضبوط تر ہو گئے تو عنقریب جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کے مینار بن کر نمودار ہوں گے۔

آج تک ہماری تحریک کے عام افراد کا درمیانہ طبقہ سے تعلق رہا ہے اس لیے دماغی اور دلی طور پر مخلص ہونے کے باوجود ہم نچلے طبقوں کی مرگ نما زیست کے گھناؤنے پہلوؤں اور جہنمی مصیبتوں کا سو فیصدی درست اندازہ نہیں لگا سکے۔ تحریک کے اس دور میں ہمارے جمہور دوست شعور کو اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں پوری طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہم عوام کے محض ہمدرد ہی نہیں بلکہ عوام میں سے ہیں۔ ہمارے ان کے مسائل قسمتیں اور دکھ سکھ سب سانجھے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ترقی پسند اور عوامی نگارشات کی طاقت کا فیصلہ مشاعروں اور ریستورانوں میں نہیں بلکہ لیبر کوارٹروں کے سامنے دھواں اگلتی چمنیوں کے نیچے اور کسانوں کے اجڑے ہوئے جھونپڑوں کے درمیان ہوگا۔ ہمیں اپنے ملک کے مزدوروں، کسانوں اور دوسرے نچلے طبقوں سے براہ راست تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم ان کو زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے بہتر خام مواد حاصل کر سکیں گے اور اپنے ادب کو جسے سماجی حربہ سمجھتے ہیں، زیادہ کارآمد بنا سکیں گے۔

ہمیں دن رات محنت کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنی تخلیقات سے عوام کو جلد از جلد خود شناسی کی سطح پر منظم کر

سکیں۔ ہمیں ملک کے فرسودہ اقتصادی نظام کو بدلنے کے لیے رجعت پرستوں کو پسپا کرنے کے لیے اور جمہوری طاقتوں کو برسر اقتدار لانے کے لیے ہرگز دیر نہ کرنا چاہیے اپنے وطن کو سربلند مضبوط اور خوشحال بنانے کے بعد ابھی ہمارے سامنے اور بھی بہت سی ذمہ داریاں ہیں، ابھی ہمیں اپنے بین الاقوامی فرائض سے بھی سبکدوش ہونا ہے..... مشرق سے مغرب تک نومولود صالح طاقتوں کا ساتھ دینا ہے، تلنگانہ کے پامرد ہمارا انتظار کر رہے ہیں، رنگون اور بنکاک کے گوریلے ہمیں مدد کے لیے پکار رہے ہیں۔ انڈونیشیا کے محب وطن ہماری راہ تک رہے ہیں۔ چین کی آزاد فوجیں ہم سے رفیقانہ تعاون مانگتی ہیں، ہمیں سب کی مدد کو پہنچنا ہے ہمیں دنیا بھر کی آمر اور بہیمانہ قوتوں کو فیصلہ کن شکست دینے میں برابر کا شریک ہونا ہے..... سقراط، گلیلیو، رالف فوکس، جیولیس فیوچک، پیروف، گیریالاکر، جبریل پیری اور تمام شہید دانشور ہمیں سلام بھیجتے ہیں، دراصل کے پانچسو نمائندہ ادیب ہماری عالمگیر قوت کا اعلان کرتے ہیں اور پیرس کانفرنس ہمارے قافلے کو نشان منزل دکھا رہی ہے۔ ہمیں مضبوطی، اتحاد اور فتح مندی سے آگے بڑھنا چاہیے..... تیسری عالمگیر جنگ کے بانی اینگلو امریکن بلاک اور اس کے حلقہ بگوش زیادہ دیر تک نہ رہیں گے۔ ہمارے لفظوں کی طاقت ایٹمی ہتھیاروں پر فتح پا کر رہے گی۔

(ادب کی ترقی پسند تحریک کا ترجمان رسالہ "سویرا" ۵، ۶۔ لاہور)

ضمیمہ ۴

عبداللہ ملک

اقبال کے خلاف چارج شیٹ

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس میں

مارچ ۲۰۰۱ء میں محترم احمد ندیم قاسمی نے ''فیض احمد فیض'' پر اپنے ایک مضمون سے کافی ہنگامہ بپا کر دیا اور اب ڈیڑھ دو مہینے گزر جانے کے بعد اس مضمون نے جو تہلکہ مچایا اس کا شور سنائی دے رہا ہے۔ اس مضمون سے احمد ندیم قاسمی نے جو نہ چاہتے ہوئے بھی فیض کے چاہنے والوں کو کافی دکھ پہنچایا ہے حالانکہ فیض کے یہ چاہنے والے خود احمد ندیم قاسمی کے بھی پرستار ہیں اور دونوں کو پاکستان کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے اہم ستون اور شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس مضمون کے بارے میں پچھلے مہینے ڈیڑھ مہینے میں تین چار مضامین لکھے ہیں۔ آج کی صحبت میں احمد ندیم قاسمی نے فیض پر جو سب سے اہم اعتراض کیا ہے کہ وہ اقبال کے معاملے میں خاصے متشدد تھے اور ان پر کسی قسم کی تنقید کو برداشت نہیں کرتے تھے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن سب سے پہلے خود احمد ندیم قاسمی کا وہ اقتباس پڑھ لیجیے:

''انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک ہفتہ وار تنقیدی اجلاس میں میں نے علامہ اقبال پر ایک مفصل مضمون پڑھا جس میں علامہ کی سامراج دشمنی، ملائیت دشمنی اور جاگیردارانہ معیشت کی واضح مخالفت کے اعتراف و تحسین کے ساتھ ہی علامہ کے بعض پہلوؤں پر گرفت بھی کی تھی اتفاق سے فیض اس اجلاس میں موجود تھے۔ میرے مضمون کے ختم ہوتے ہی وہ ناگواری بلکہ غصے کے واضح تیوروں کے ساتھ بولے اور میرے مضمون کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں میں نے علامہ کی بعض سرگرمیوں پر گرفت کی تھی۔ ان کی مخالفت تو مبارک تھی مگر عمر بھر یہ افسوس رہا کہ فیض صاحب نے میرے دو تین اعتراضات کا کوئی جواب دینے کی زحمت نہ کی بلکہ زور اس نکتے

پردیتے رہے کہ شعروادب کی بڑی شخصیتوں کی مثبت کارکردگی کے بعدان کی بعض منفی سرگرمیوں کو نظرانداز کردینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ یہ ساری بحث کسی رسالے یا اخبار میں شائع ہوئی بھی تھی مگر روزنامہ ''احسان'' کے مدیر ابوسعید بزمی (مرحوم) نے دوروز تک طویل اداریے لکھے تھے اور مجھے سب نے بہت بری طرح گردن زدنی قرار دیا تھا۔''

احمد ندیم قاسمی جس رسالے کا ذکر کر رہے ہیں وہ رسالہ خود احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کی ادارت میں شائع ہونے والا ترقی پسند تحریک کا نقیب ماہنامہ ''سحر'' تھا۔ اس رسالے کی ادارت میں ہاجرہ مسرور اور حمید اختر کے نام بھی شامل تھے۔ چنانچہ ''سحر'' جولائی اگست ۱۹۵۰ء کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ جو مجھے اپنے پرانے کاغذات اور دستاویزات میں ملا ہے اور ساتھ ہی میری وہ ڈائری بھی ملی جو میں نے اس زمانے میں لکھی تھی جب ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہوا تھا اور اس کی اطلاع مجھے لاہور کے شاہی قلعے میں ملی تھی جہاں میں ان دنوں نظر بندی کے دن گزار رہا تھا۔

اس رسالے میں احمد ندیم قاسمی جی کے اس مضمون کا اہم حصہ شامل ہے اور ساتھ ہی اس پر کی جانے والی بحث بھی ہے اور اس میں خود فیض صاحب نے کھل کر اور وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بحث میں بڑی خوشدلی سے حصہ لیا ہے اس کا اندازہ قاری کو اس پوری بحث اور مضمون پڑھ کر ہو جائے گا اب مضمون اور بحث ملاحظہ ہو:

اقبال کی شاعری پر مباحثہ: اپریل کے آخری ہفتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی مختلف شاخوں کے جلسوں میں علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ پر مباحثے ہوئے۔ شاخ لاہور، کراچی اور لندن میں کافی تفصیلی مباحثے ہوئے۔ لاہور اور کراچی کی روئدادیں تو ہمیں موصول ہو چکی ہیں مگر ابھی تک لندن کی شاخ کی طرف سے رپورٹ وصول نہیں ہوئی۔ ہم لاہور اور کراچی کی بحثوں کو شائع کر رہے ہیں تاکہ دوسری شاخیں بھی ان مباحثوں کی روشنی میں اپنے طور پر مباحثہ کریں۔ انجمن اجتماعی طور پر اسی طرح کسی نتیجہ پر پہنچ سکے گی۔ احمد ندیم قاسمی نے اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ شعر کے متعلق تحریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ان کے مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

اقبال کے صحیح مطالعے کے لیے ہمیں اس دور کا تاریخی جائزہ لینا ہوگا جس میں اقبال کے کلام کے تو مجموعے لکھے گئے انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا اور ۱۹۳۸ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ نصف صدی ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی بیداری اور نئی نئی سیاسی تحریکوں کی اٹھان کا دور ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل ایشیا پر سامراجی تسلط کی کارفرمائیاں اور پھر جنگ عظیم تحریک ترک موالات، تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد، سائمن کمیشن اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا

دور، تحریک سول نافرمانی اور نیا قانون...... ہندوستان سے باہر پہلی جنگ عظیم سے پہلے روس میں انقلاب ہوتا ہے جو نا کام ہوتا ہے جنگ کے بعد کا روسی انقلاب جو کامیاب رہتا ہے اور ساری دنیا اس سے متاثر ہوتی ہے۔ ڈکٹیٹر پیدا ہوتے ہیں اور اقبال کی وفات سے ایک ہی برس بعد دنیا کو ایک اور تباہ کن جنگ عظیم میں جھونک دیتے ہیں چین کا عوامی انقلاب اس دوران میں جاری رہتا ہے۔ ہندوستان سے باہر گورکی اور رومان رولاں جیسے ادیب ہیں ہندوستان میں ٹیگور اور پریم چند ہیں۔ انگریزی استعمار کا بھرم قدم قدم پر ٹوٹتا ہے کروڑ پتی رہنما عوام کو قومی جھنڈوں کے نیچے جمع کرتے ہیں۔ سیاست کی گرم بازاری میں صرف امارت ہی لیڈری کا تمغہ لگا سکتی ہے۔ یہ ایک مسلسل ہاؤ ہو، شور وشغب، مار دھاڑ، لوٹ کھسوٹ، جوش و ولولہ اور تیزی و تندی کا دور ہے اور اس کی لپیٹ میں ہندوستان کے چالیس کروڑ عوام ہیں جن میں دس کروڑ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی ہیں اور سکھ، پارسی، عیسائی اور بدھ وغیرہ بھی۔ انگریز کے دم سے ملیں کھل رہی ہیں سامنتی نظام میں گھن لگ چکا ہے سرمایہ داری ابھر رہی ہے اور فرقوں یا مذہبوں کی جگہ قومیں بٹی جا رہی ہیں۔ اس دور میں اقبال فن کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اقبال مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے عہد زوال کی پیداوار ہیں۔ غدر کے بعد ہندوستان میں قومیت کا جو سیلاب آیا تھا، اقبال اس سیلاب کی ایک زبردست لہر ہیں اس سے اقبال کے پہلے تضاد کی ابتدا ہوتی ہے۔ اقبال چالیس کروڑ کی آبادی کے ایک محکوم ملک کے فرد ہیں۔ ملک باوجود محکومی کے معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی کر چکا ہے لیکن اقبال مارے قوم پرستی کے ماضی کے گیت گاتے ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت اکبرالہ آبادی نے بھی کی اور اقبال نے بھی، مگر دونوں کے انداز میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں جذباتی قسم کی مخالفت میں نہایت گھسی پٹی قدامت دوستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں مشرق و مغرب کے علوم جدیدہ سے فیض یاب ہیں اور پھر اقبال کو تو یہ قدامت دوستی قطعی زیب نہیں دیتی کیونکہ وہ انسان کے مسلسل ارتقاء کے قائل ہیں اور خوب سے خوب تر کی طرف مسلسل پیش قدمی ان کے نزدیک انسان کی بڑی مقدس عبادت ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے وہ مسلمانوں کے عہد زوال کی پیداوار ہیں اس لیے انھیں ماضی بھلا لگتا ہے اور وہ مستقبل کی رجائیت کو بھی قدامت آلودگی سے نہیں بچا سکتے۔ وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اسلام کا ماضی نہایت کریہہ قسم کی ملوکیت سے آلودہ ہے اور ان مسلمانوں کا وظیفہ، حیات محض یہ رہ گیا ہے کہ ان جابر و قاہر شہنشاہوں کی ظل الٰہیت ثابت کرنے میں تمام تاریخی عوامل اور ارتقائی قدروں سے آنکھیں پھیر لی جائیں۔ اقبال نے بھی یہی کیا اور ملوکیت کے زوال کے دور میں اپنی فارسی تصنیف افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کی خدمت میں پیش کر دی اور انتساب بھی کیا:

اے امیر ابن امیر ابن امیر
ہدیہ از بینوائے من پذیر

اور پھر لطیفہ یہاں پیدا ہوا جب امان اللہ خان ''کہستاں میں پیغام عشق'' تازہ کرنے کے بجائے قندھار اور بمبئی کے رستے روم بھاگ گیا اور نادر شاہ نے اپنے بادشاہ کا حق غصب کر کے افغانستان کی گدی سنبھال لی اور اقبال نے اپنی 'مثنوی مسافر' اس نئے بادشاہ کے قدموں میں ڈال دی۔ یہ فن کارانہ خلوص اور دیانت کی کوئی اچھی مثال نہیں۔ اقبال کو اپنی غلطی کا احساس ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کے بعد ضرب کلیم کو ''اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں'' یہ کہہ کر پیش کر دیا:

بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اقبال جس دور میں سانس لے رہے تھے وہ امان اللہ یا نادر خاں یا نواب بھوپال ایسے چند بڑے پیمانے کے جاگیرداروں کا دور نہیں تھا۔ یہ آزادی کی تحریکوں کا دور تھا۔ گاندھی اور محمد علی کا دور تھا لیکن اقبال کو مصر و حجاز، عراق و ایران اور افغانستان کی یاد ستاتی رہی اور ہندوستان کا ذکر کبھی آیا بھی تو مسلم ہندی کے سلسلے میں اور اس طبقے کے دکھوں کا مداوا بھی ڈھونڈا تو ماضی میں۔ ماضی کے ورثے کو زیر عمل لانے کے لیے اقبال کے پاس خودی کا فلسفہ ہے۔ اقبال تصوف کے مخالف ہیں تصور پرستی، رہبانیت اور انفعالی قسم کی روحانیت کو بہت برا سمجھتے ہیں مگر اس تصوف سے بھاگ کر ایک اور تصوف میں پناہ لیتے ہیں جو پہلے تصوف سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، عینیت کی ایک بگڑی ہوئی یا سنوری ہوئی صورت ہے۔ وہ مروجہ تصوف میں نفی خودی کی تلقین کے مخالف ہیں اور مومن کے ارتقا کے لیے خودی کی پرورش کو بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن ضبط نفس کے بغیر پرورش پائی ہوئی خودی کو ابلیس کی صفت قرار دیتے ہیں۔ یہ فلسفہ نیا نہیں اقبال نے اس پر زور دیا ہے اس لیے یہ فلسفہ انہی سے منسوب کر دیا گیا ہے اگر وہ فرد کی خودی کے خول سے نکل کر جماعت کی خودی کو معیار ارتقا قرار دیتے تو شاید کچھ بات بن جاتی اور وہ تصور پرستی سے بچ جاتے مگر وہ انفرادیت کے خول تک کو نہیں توڑ سکے اور اس لیے ان کی خودی نطشے کے فوق البشر کے تصور سے جا ملتی ہے۔

نطشے کے بارے میں اقبال نے کئی اشعار لکھے ہیں اور پھر پیام مشرق کے دیباچہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے اس کا دماغ کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ گو بعض نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں۔ اقبال کی زندگی میں نطشے کے شاگردوں نے فسطائیت یعنی اقتدار پرستی، نسل پرستی، نسلی برتری اور استعمار کا بازار گرم کر دیا تھا مگر نطشے کے فلسفے کے بعض نتائج سے اقبال کے اتفاق نے ان سے مسولینی کے بارے میں یہ کہلوا دیا:

فیض یہ کس کی نظر کا ہے، کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب

حبشہ پر مسولینی کی یلغار کا ذکر کیا ہے اگر کچھ اس انداز سے جیسے یورپ کی دوسری قوموں کی استحصالی سرگرمیوں

کے سہارے مسولینی کے اس اقدام کا جواز پیدا کر رہے ہیں بہر کیف اقبال کے مردمومن اور نٹشے کے فوق بشر کا رشتہ اتفاقی نہیں۔ اقبال شعوری طور پر نٹشے سے متاثر ہیں اور اس کا سارا فلسفہ انھوں نے اپنے شاہین میں منتقل کر لیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نٹشے نے مسیحی فلسفہ سے اکتا کر نسلی برتری پر زور دیا۔ اقبال نے مذہبی برتری کا اعلان کیا۔ کروڑوں عوام کی محکومی کے معاملے میں دونوں متفق ہیں اقبال کے مردمومن اور نٹشے کے ڈکٹیٹر میں کوئی فرق نہیں۔ اقبال کے مردمومن کی ترقی یافتہ خودی ذات کبریائی سے احکام حاصل کرتی ہے اس لیے عوام کو چون و چرا کی گنجائش نہیں (عوام کی زبان کاٹ لینے کے سلسلے میں مردمومن اور ہٹلر و مسولینی میں بہت معمولی فرق باقی رہ جاتا ہے۔) اقبال کے فلسفے اور فنی نظریے کی بڑی زبردست ٹریجڈی ہے۔ اس یکسانیت اور مماثلت کی تاویل دشوار ہے۔ نٹشے، ہٹلر اور مسولینی کی پرورش کرتا ہے اقبال کا فلسفہ خودی ایک جابر و مطلق انسان بادشاہ پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ حاکم کے لیے کبوتر پر جھپٹنے کے مزے ہیں اور محکوم کے لیے فقر ہے اور استغنا ہے اور توکل ہے اور درویشی ہے۔ یہی وہ سامنتی ذہنیت ہے جس نے اقبال کی بے پناہ خلاقانہ قوتوں کو محدود کر دیا ہے اور جس نے نواب بھوپال کو اقبال کا ہیرو بنا دیا ہے۔

اقبال جماعت کی خودی کو اپنی منزل قرار دے کر تصور پرستی کے خول کو توڑ سکتے تھے مگر ان کی بنیاد ہی مخدوش ہے وہ تو روحانی انقلاب کو ہر مادی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں اور خیال و وجدان کی اولیت کے قائل ہیں۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں اس کا اقرار کر چکے ہیں۔ ان پر اقبال کا سارا جوش، ولولہ، زندگی کی حرکت، تیزی و تندی، ارتقاء اور تسخیرِ فطرت غرض ساری ہمہ ہمی باطل ہو جاتی ہے اور وہ داخلیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ روح اور جسم میں ایک امتیاز کھینچ دیتے ہیں اور ''جاوید نامہ'' میں مارکس کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دین آں پیغمبر حق ناشناس
برمساوات شکم دارد اساس

کیا ''مساوات شکم'' سے انانیت، ایگو، فرد کی خودی، انوشن، جبلت، وجدان اور ضمیر وغیرہ کے فلسفے پیش کرنے والوں کی ساری الجھنیں دور نہیں ہو جاتیں؟ اور کیا مفلس قلاش اور فاقہ کش مزدور کسان اصفہانی اور ہارون اور لیاقت علی کی سی خودی کی اپنے اندر پرورش کر سکتے ہیں؟ اور کیا اس قسم کی خودی مکھن اور گھی کی بھوکی نہیں؟ یہ الگ بحث ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اقبال کو شکم کی متقضیات سے الٰہی بغض ہے اور وہ بھی محض فن کی حد تک۔ عملی زندگی میں انھوں نے شکم کو کبھی ثانوی حیثیت نہیں دی اور ان کے خطوط اس حقیقت کا ثبوت ہیں اور یہ ثبوت بڑا بھیانک ہے۔ اقبال کا سارا کلام ''مساوات شکم'' کی مخالفت کے جوش میں عقل و خرد اور ادراک و خبر کے خلاف ایک مہم ہے۔ یہاں اقبال کا ایک اور تضاد پیدا ہوتا ہے اور یہ پہلے تضاد سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔

اقبال خودی کی پرورش و نمو کے ضمن میں بار بار انسان اور فطرت کے درمیان ایک مسلسل جنگ کا نعرہ لگاتے

ہیں۔ یہ بڑا خوش آئند نعرہ ہے اس سلسلے میں انھوں نے بڑی پائے کی نظمیں کہی ہیں۔ ''پیامِ مشرق'' میں محاورہ مابین خدا و انسان پڑھیے انسان تسخیرِ فطرت کے کارنامے کو کیسی خود اعتمادی سے بیان کرتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی تخلیقی قوتوں کا کتنا عظیم اور پر اعتماد اعتراف ہے مگر انسان کی عظمت مذاق معلوم ہونے لگتی ہے۔ جب خود اقبال کی نظر میں یہ سارے خارجی مظاہر اعتباری ہیں انسان فطرت کی تسخیر چاہتا ہے مگر وہ اپنے ماحول سے ٹکرا کر کچھ نہیں کر سکے گا اسے من کی دنیا میں ڈوب جانا ہوگا۔ اس لیے کہ انسانی ذہن کے ماورا جو کچھ ہے وہ محض خیال کی چمن آرائی ہے۔ فلسفے کے صابن کے جھاگ سے اس قسم کے رنگارنگ بلبلے صدیوں تک پیدا کیے جاتے رہے ہیں اور ثابت کیا جاتا رہا ہے کہ جو کچھ ہے وہ ذہن اور وجدان ہے۔ اس سے باہر کی دنیا ذہن کی چمن آرائی ہے اور اسی لیے انسانی سرشت کو کوہی و مہتابی قرار دیا ہے۔ یہ سائنس اور مادی حقائق سے انکار کے مترادف ہے۔

فطرت کی تسخیر کے سلسلے میں اقبال کا یہ تضاد زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب وہ تسخیرِ فطرت کا ایک ہی گر بتاتے ہیں اور وہ ہے خودی کی پرورش۔ سوال یہ ہے کہ کیا خودی کی ترقی سماج کے مروجہ نظام اور طبقات میں ممکن ہے؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتے اور شاید سوچتے بھی نہیں۔ خودی کی ترقی اور تسخیرِ فطرت آج کس نظام میں ممکن ہے؟ یہ بھی نہیں بتا سکتے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اقبال مادی علوم مادی مظاہر اور مادی حالات کو قطعی ثانوی حیثیت دیتے ہیں اور انھیں محض ''شوخیِ افکار'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ تصور پرست ہیں وجدان کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ عینیت انھیں ماضی پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ دراصل وہ خارجی دنیا کو مادے کی شرارت پر محمول کرتے ہیں اور مادیت کے کٹر مخالف ہیں۔ شاید ان کے پیشِ نظر اٹھارویں صدی کی مادیت ہے جس کے علمبردار کانٹ اور ہیوم ہیں انیسویں صدی کی مادیت جس کی بنیاد سائنس پر ہے کو انھوں نے سمجھا یا پڑھا ہی نہیں صرف رُوسی انقلاب کی اطلاع ان تک پہنچی ہے وہ مادیت کو صرف دہریت اور لامذہبیت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ انیسویں صدی کی مادیت کا فلسفہ نظریے اور عمل کے اشتراک سے ایک زبردست سماجی ارتقائی فلسفہ ہے۔ تسخیرِ فطرت کا فلسفہ ہے، تخلیق کا فلسفہ ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو خودی کی اکائی کے تنگ دائرے سے نکال لاتا ہے۔ اسے عوامی تحریکوں میں شامل کرتا ہے اور سائبیریا کے برف زاروں کو مرغزار بناتا ہے اور سدا بہار گندم پیدا کرتا ہے۔

دراصل اقبال کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ مشین کے مالک کے بجائے مشین کے خلاف ہیں۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ انسانی ارتقا کی تاریخ آلات پیداوار کی ترقی کی تاریخ ہے۔ آلات، آگ، بھاپ، ایٹم، یہ سب چیزیں جن سے دنیا کی ترقی عبارت ہے الہامی علوم کے بجائے مادی علوم سے معلوم کی گئی ہیں اور وہ مابین خدا و انسان جب انسان اپنی تخلیقی قوتوں اور اپنی حسن کاری اور ترقی کا ذکر کرتا ہے تو اقبال سے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا چراغ اور ایاغ اور خیابان و گلزار و باغ اور آئینہ اور نوشینہ یہ سب چیزیں کسی فرد کی نہایت ترقی یافتہ خودی نے ایجاد کیں یا تسخیر فطرت کے سلسلے میں انسان اپنے ماحول سے متصادم ہوا اور رات کے مقابلے میں چراغ، کہسار و راغ کے مقابلے میں گلزار و باغ پیدا کیں۔ پتھر سے آئینہ تراشا اور زہر سے نوشینہ نچوڑا اور کہیں اقبال کی داخلیت اور تصور پرستی کی پایابی کا راز کھل جاتا ہے۔ آج طبقاتی تضاد کو سمجھنا، اسے مٹانا اور اجتماعی طور پر آگے بڑھ کر ذرائع پیداوار پر قابض ہونا فرد کی خودی کی پرورش سے کہیں زیادہ ضروری ہے مگر اقبال عجیب مشکل میں گرفتار ہیں۔ آگے بڑھتے ہیں تو مادہ جکڑتا ہے اور مشین ڈراتی ہے پیچھے ہٹتے ہیں تو فرنگی دبوچ لیتا ہے جس سے انھیں نفرت ہے اسی لیے وہ داخلیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ داخلیت جو انھیں مذہبی برتری اور ڈکٹیٹر شپ تک لے جاتی ہے۔

اقبال مشین سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ مادیت سے خوفزدہ ہیں اور یوں پیداوار کے ایک انتہائی ترقی یافتہ ذریعے کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے باوجود وہ فطرت اور انسان کی جنگ چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مشین کے بغیر، سائنس کے بغیر علم اور خبر کے بغیر یہ جنگ محض ہوائی ہے۔ اقبال مشین کی طرح دولت کو بھی بُرا کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا ہدف تقسیم دولت کا مروجہ طریق ہونا چاہیے تھا۔ غرض اقبال بالکل ایک ''یوٹوپین'' کی طرح سوچتے ہیں۔

رہ گئی اقبال کی سامراج دشمنی تو اس کی بنیاد بھی گہری نہیں، وہ سامراج کے دشمن ضرور ہیں مگر اپنے کلام میں اپنے ملک کی تحریک آزادی کی ایک ذراسی جھلکی بھی لانا گوارا نہیں کر سکتے، ان میں اتنا بھی حوصلہ نہیں کہ انگریزی برسر اقتدار طبقہ کی کھلم کھلا مخالفت کریں، افرنگ سے ان کا مقصد سارے یورپ سے اور ساری یورپی اقوام سے ہے، صرف انگریز سے نہیں، صرف انگریز کے خلاف تو ٹیگور، پریم چند، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ ہی لکھ سکتے تھے، انہیں اعلانِ حق سے کوئی قوت نہیں ڈرا سکتی تھی، لیکن اقبال ساری عمر سیاسی شاعری کرتے رہے مگر سامراج کی مخالفت میں انگریز کی تخصیص کا حوصلہ نہ کر سکے، اس لیے کہ انگریزی قانون کی گرفت بہت کڑی تھی، یہ اپنے زمانے کی ایک بڑی شخصیت کی کم ہمتی اور خوف زدگی کی بین دلیل ہے اور اسے بڑے اہتمام سے عوام سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویسے بھی ان کے پاس سامراج کی مخالفت کے سلسلے میں کوئی منضبط عملی خاکہ نہ تھا، وہ اپنے خیال کو کسی منطقی نتیجے تک پہنچانے کی تکلیف ہی نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے اپنے خیال کی عملی صورت سے باخبر تھے۔

سامراج دشمنی کے بعد ان کی محکومیت دشمنی ہے اور یہ بھی جذباتی ہے، غلامی سے نفرت کا جذبہ بڑا مبارک جذبہ

ہے مگر اپنے حاکم کے ہر شعبہ حیات سے نفرت دُور اندیشی یا حکمت نہیں، آخر فن کار کو انتخاب بھی تو کرنا چاہیے۔ وہ اسی جوش میں مغربی جمہوریت تک کو رگید اکیے ہیں اور اس کی چوٹ پر ڈکٹیٹر شپ پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے متعلق ان کے اردو فارسی کلام میں ہمیں کچھ نہیں ملتا۔ ہندوستان کے بجائے وہ وادی نیلم اور نجد، عراق، ایران اور افغانستان کی طرف دیکھتے ہیں اور ملکی تحریکیں ان کی طرف ہاتھ بڑھاتی رہ جاتی ہیں۔ اس لیے کہ ملکی تحریکوں میں حصہ لینے سے انگریز کم بخت جیل میں بھیج دیتا تھا۔

آزادیِ نسواں کے سلسلے میں تو اقبال کا رول انتہا درجہ کا رجعت پسندانہ ہے:

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہبان ہے فقط مرد

یہاں انھوں نے عورت کی خودی تک کو ہمیشہ کے لیے دفنا دیا ہے، معلوم ہوتا ہے اقبال صرف مرد کی خودی کے قائل تھے۔ ورنہ دنیا کی نصف سے زیادہ آبادی یا دنیائے اسلام کے نصف سے زیادہ افراد کو ہمیشہ کے لیے غلامی کے ایک روایتی جوئے کے حوالے نہ کر دیتے، اگر کہیں آزادی نسواں کی ہلکی سی جھلکی دکھائی دی بھی ہے تو چند ایسی اخلاقی پابندیوں کے ساتھ مشروط جن کا طبقاتی سماج کے اقتصادی اور معاشی پہلوؤں سے کوئی رشتہ نہیں۔ مشرق کی عورت اقبال کو اس بنا پر مشکل ہی سے معاف کر سکے گی۔ آخر عورت کے مسائل کو ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغان حجاز'' میں لانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اقبال نے کھلم کھلا ہتھیار ڈال دیئے اور کہا:

میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غم ناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدہ مشکل کی کشود

میرے خیال میں اقبال کے اس عجز کے متعلق اقبال کو مجدد کا درجہ دینے والوں نے فی الحال غور نہیں فرمایا، اقبال قوت کے شاعر ہیں، اسلام کے عروج کے لیے انہیں قوت کی جستجو ہے اور وہ یہ قوت ہر جگہ سے حاصل کرنے کو تیار ہیں۔ اسی لیے تو وہ نیٹشے اور مارکس، مسولینی اور لینن وغیرہ کو قبول بھی کرتے ہیں اور رد بھی کرتے ہیں۔ جزوی حیثیت سے وہ سب کے ساتھ ہیں، کلی طور پر صرف اسلام کے ساتھ ہیں، جہاں تک دوسرے فلسفے اسلام کا ساتھ دیتے ہیں، اقبال انھیں قبول کرتے ہیں۔ اس سے آگے ان کا وجود اقبال کے لیے ختم ہو جاتا ہے اسی لیے تو وہ مولانا روم سے الگ نہیں ہو سکتے، جہاں چاہتے ہیں مولانا روم کو اپنے ساتھ ڈھال کے طور پر رکھتے ہیں (اور یوں اپنے ہی فلسفہ خودی کی مخالفت کے مرتکب ہوتے ہیں) اسی لیے تو اقبال کا مجموعی مطالعہ نہ کرنے والے ان کے اشعار کہیں کہیں سے چُن چُن کر اقبال کو ہر زمانے کا ترقی پسند ثابت کرنے کے عادی ہیں۔ مزدور، دہقان اور محنت کے حق میں ان کے بڑے اچھے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں، مگر ان اشعار کو ان کے content میں پڑھیے۔ اور پھر سارے کلام کو اقبال کے زمانے کے مطابق تاریخی طور پر رکھیے، اقبال

اچانک بہت دور، بہت پیچھے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اہم ترقی پسند مصنفین اگر اقبال کے نظریات کے بجائے اقبال سے صرف یہ حاصل کریں کہ انھوں نے اردو شاعر کو سوچنا سکھایا اور اگر ہم ان کے جوش زندگی اور ولولہ حیات کو پرکھ کر اسے اپنے ڈھب سے استعمال کریں۔ ان سے فن میں روایت اور بغاوت کا امتزاج سیکھیں اور ان کی ڈکشن، استعاروں اور تشبیہات پر غور کریں تو بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بنیادی نظریات کا تعلق ہے ہم ان کے ہم نوا نہیں ہو سکتے، اور پھر اب تو پاکستان کے حکمرانوں اور چند ادیبوں نے بھی انھیں شاعر کے بجائے فلسفی کہنا شروع کر دیا ہے اور ان کے ملفوظات کچھ اس طرح پیش کیے جا رہے ہیں جیسے کوئی ولی اللہ بول رہا ہے، اور آج اقبال کو شاعر کہنا اقبال کی ہتک کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے لیکن ترقی پسند مصنفین اقبال کو صرف ایک عام فن کار کی حیثیت سے پرکھیں گے اور کبھی اس ہالے سے متاثر نہیں ہوں گے جو اقبال کو استعمال کرنے والوں نے اس کے فن، اس کے نظریے اور اس کی شخصیت کے اردگرد کمال خودغرضی اور بیداری سے منڈھ دیا ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ۱۳ جون ۲۰۰۱ء)

ضمیمہ-۵

احمد ندیم قاسمی

ایک نیا شوشہ

"طلوع" لکھا جا چکا تھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے خلاف رجعت پرست اور قدامت پسند عناصر نے ایک اور شوشہ چھوڑا اور الزام تراشا کہ یوم مئی کے موقع پر ترقی پسند مصنفین نے حضور پیغمبر اسلام صلعم اور اسلام کے خلاف کچھ کہا۔ یہ الزام قطعی بے بنیاد تھا، انجمن کی طرف سے اس کی تردید کی گئی، مگر معترض طبقے کا تجارتی مفاد اسی میں تھا کہ اتہام تراشی کی مہم تھمنے نہ پائے، ان حالات میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذمہ دار ممبر اور ادارہ نقوش کے رکن احمد ندیم قاسمی نے ایک بیان اخبارات (۲۰ اور ۲۱ مئی) کے نام جاری کیا، ذیل میں اسے قارئین نقوش کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، معاونین اور قارئین سے درخواست ہے کہ وہ یہ آئینہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے ہر مخالف کو دکھائیں۔ (احمد ندیم قاسمی)

....

گذشتہ چند ہفتوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے ممبروں کے خلاف ایک طبقے کی طرف سے غلط فہمیاں پھیلانے کی مہم نہایت سرگرمی سے جاری ہے۔ اگرچہ اب معترضین کے اصلی مقاصد ان کی اندھا دھند اور بے بنیاد مخالفت سے، نیز بوکھلاہٹ میں لکھے ہوئے ان کے مضامین سے صاف جھلکنے لگے ہیں۔ اور پاکستان کے عوام کو اس کا احساس ہو رہا ہے کہ معاملہ مذہب کا نہیں بلکہ ذاتی مفاد کا ہے مگر اس موقع پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس انجمن میں شرکت کے متعلق عوام کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دوں تاکہ مزید غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا تدارک ہو سکے۔ اس سے پہلے بھی خود میں نے اور انجمن کے دوسرے ممبروں نے انجمن کی پالیسی کو کئی بار واضح کیا ہے لیکن پاکستان میں چند ایسے عناصر بدستور ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں جو انتہاوی دریدہ ذہنی سے اسلام کو (نعوذ باللہ) کھلونا بنا کر عوام کو ورغلاتے رہتے ہیں اگرچہ وہ عنقریب ارتقاء کی فطری یلغار کی زد میں آ کر کچلے جائیں گے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ایک خالص ادبی ادارہ ہے اس کا ممبر بننے کی واحد شرط یہ ہے کہ انجمن کے منشور اور اغراض و مقاصد سے اتفاق ہو۔ اس کے لیے کسی خاص سیاسی جماعت کا موید ہونا ضروری نہیں۔ اگرچہ ترقی پسند سیاسی شعور

لازمی ہے اس انجمن میں ہر سیاسی نقطۂ خیال کے فن کار موجود ہیں۔ کمیونسٹ بھی اور غیر کمیونسٹ بھی اور یہ سب فنکار ایک ہی ادبی پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہیں کہ انھیں اس انجمن کے منشور سے اتفاق ہے اور وہ ادب کو تنقید حیات اور تطہیر حیات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کا جنرل سیکرٹری ہوں اور عقیدے کے لحاظ سے مسلمان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو وحدہٗ لاشریک اور حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ والہ اصحابہ وسلم کو ختم المرسلین مانتا ہوں۔ اس کی گواہ میری تحریریں بھی ہیں اور میرا عمل بھی۔ میں نے پاکستان کو مسلمانوں کی ملی بقا کا واحد ذریعہ سمجھ کر اس کے حصول کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ قربانیاں دیں تحریر و تقریر اور نشریات کے ذریعے قیام پاکستان سے پہلے اس کے حصول اور حصول پاکستان کے بعد اس کے لیے استحکام کا فریضہ ادا کیا۔ (اطلاعاً یہ بھی عرض کر دوں گا کہ پشاور اور لاہور ریڈیو سے میرے اسلامی اور ملی ترانے ریکارڈ ہو کر باقاعدہ نشر ہو رہے ہیں اور ریڈیو پاکستان لاہور سے میرا ملی ترانہ' سدا اونچا ہے جھنڈا ہمارا' مسلسل براڈکاسٹ ہو رہا ہے ان سب حقائق کے باوجود میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہوں۔ محض اس لیے کہ اس انجمن کا منشور میرے مذہبی عقائد میں حائل نہیں ہوتا اور اس منشور کی کوئی شق غیر اسلامی نہیں۔ میرے علاوہ راسخ العقیدہ مسلمان ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس انجمن میں شریک ہے۔

میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کا پرانا ہمنوا ہوں۔ تقسیم ہند سے پہلے مجھے انجمن کے چند اقدامات اور اس کے چند سرکردہ ممبروں سے مختلف اوقات میں شکایتیں ضرور پیدا ہوئیں جن کی میں نے کبھی پردہ پوشی نہ کی بلکہ اپنے ان اختلافات سے ادیب دوستوں شناساؤں اور مدیروں تک کو مطلع کرتا رہا تا کہ انجمن سدھرے اور وہ تحریک بے داغ رہے قیام پاکستان سے پہلے میں نے ملک خضر حیات ٹوانہ کے حلقہ انتخاب میں مسلم لیگ کا جھنڈا بلند کیا اور انگریز پرست جاگیرداروں سے پلی ہوئی اس سرزمین میں بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔ مگر ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مجھے اچانک اس انتہا درجہ کی تلخ اور دردناک حقیقت کا احساس ہوا کہ ہمارے عوام کے معیار زندگی میں ترقی کے بجائے تنزل پیدا ہو رہا ہے اور ان گنت قربانیوں سے حاصل کی ہوئی آزادی صرف ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جن کے استقبال کے لیے میں نے دور افتادہ دیہات میں میلوں لمبے جلوس نکالے اور اپنے عزیزوں کو جو سرکاری ملازم تھے یونینسٹ وزارت کے غیض وغضب کا نشانہ بنا دیا، عوام کو ان کی آزادی واپس دلانے کے جذبے سے بے تاب ہو کر میں لاہور آیا اور یہاں سے وہ قلمی جہاد شروع کیا جس کی دھمک آج کراچی سے چترال تک سنائی دے رہی ہے۔ اس وقت سارے پاکستان میں صرف انجمن ترقی پسند مصنفین ہی ایک ایسا ادارہ تھا جس کے پاس عوامی زندگی کو آزادی سے بہرہ یاب کرنے اور ایک ایسے نظام کو پاکستان میں رائج کرنے کا پروگرام تھا جس کا عنوان اقتصادی توازن اور سماجی مساوات تھا۔ میں نے انجمن کے تنظیمی کاموں میں اپنے دوسرے رفیقوں کی طرح نہایت سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا اور آج یہ تحریک جس اوج پر ہے اس کا صحیح اندازہ سب سے زیادہ ہمارے معترضین کو ہوگا۔

یہ طویل پس منظر پیش کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمارے عوام اب ذرا انجمن ترقی پسند مصنفین پر گندگی

اچھالنے والوں کے بارے میں بھی سوچیں، پاکستان کے قیام میں انھوں نے کیا حصہ لیا۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء تک حضرت قائداعظم کو برا بھلا کہتے رہے انھوں نے لیگ کے رہنماؤں لیگ کے طریق کار اور اس کے مقاصد کی شدید مخالفت کی انھوں نے پاکستان دیوانے کا خواب کہہ کر اس کا مذاق اڑایا اور پنجاب میں تو انھوں نے اس یونینسٹ پارٹی کی خیر خواہی کا حق ادا کیا جس کا نام قیام پاکستان کی تاریخ میں جب بھی آئے گا اس پر ہر نسل پھٹکار بھیجے گی۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے معترضین نے پاکستان کا بنا بنایا نوالہ اٹھا کر نگل لیا۔ ترقی پسند ادیب ایسے ہی مفت خوروں اور موقع پرستوں کے نظریاتی بھانڈے چوراہے میں پھوڑتے ہیں اور اسی لیے کافر اور ملحد قرار پاتے ہیں۔ ان کی انجمن میں کمیونسٹ بھی شامل ہیں اس لیے بھی وہ گردن زدنی قرار پاتے ہیں۔ حالانکہ اگر دو مختلف عقائد کے اشخاص سوچ بولنے پر متفق ہوں تو محض اختلاف عقائد کی بنا پر سچ کو چھوڑ کر جھوٹ بولنے کی تاویلیں سوچنا دماغی توازن اور اسلامی روایات کی پیروی کا کوئی اچھا ثبوت نہیں۔

مجھے ان علمائے دین پر افسوس بھی آتا ہے اور حیرت بھی ہوتی ہے جو سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے بھولے بھالے عوام کو ترقی پسند ادیبوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ ان کے عالمانہ بصیرت و متانت کے مدنظر ضروری تھا کہ وہ ترقی پسندوں کے ذمہ دار ارکان سے استفسار کرنے کے بعد اس میدان میں اترتے اور استشہاد کے اوّلین اصول سے روگردانی کر کے اسلام کی عالمگیری اور ہمہ گیری پر حرف نہ لاتے اور اس طبقے کی ہموائی میں ذرا سوچ سمجھ سے کام لیتے جس کے مقاصد خالص غیر اسلامی غیر جمہوری اور اسلام کش ہیں اور یہ مقاصد ہیں جاگیرداری سرمایہ داری اور فسطائی طریق کار کا تحفظ۔ امیروں کو زیادہ امیر اور غریبوں کو بے انتہا غریب بنانے کو اخلاقی اور روحانی مہم قرار دینے کا فریب اور اسلامی اصولوں کی غیر اسلامی تاویل پیش کر کے مذہب کی روحانی قوتوں کی نفی۔

رہی یوم مئی کے سلسلے میں چند افراد کی ہنگامہ آرائی تو میں اس ضمن میں پہلے بھی بحیثیت جنرل سیکرٹری صفائی پیش کر چکا ہوں اور آج پھر انفرادی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں کہ اگرچہ علالت کے باعث میں اجلاس میں شریک نہ ہو سکا لیکن وہ مضامین نظم و نثر منگا کر پڑھے جو یوم مئی کی تقریب میں سنائے گئے تھے۔ ان میں کہیں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (خاکم بدہن) توہین نہیں تھی۔ اگر کچھ تھا تو آزادی کے بعد کانگرس اور لیگ کے عوام کش طرزِ عمل پر تنقید تھی اور پاکستان کو عوامی پاکستان بنانے کی امنگ تھی۔ اگر مبینہ الزامات کی مجھے ذرا سی بھی جھلک نظر آتی تو یقیناً میں یوم مئی کی مخالفت کرنے میں ان اصحاب سے زیادہ تیز ہوتا جنھوں نے محض مصلحتاً پاکستان کو تسلیم کیا ہے اور جن کا کوئی سیاسی مسلک اور کوئی صحافتی یا ادبی نظریہ نہیں۔

میں نے اپنی تخلیقی قوتوں کو پاکستان کے عوام کی بہبود اور ان سے ہتھیائے ہوئے بنیادی انسانی حقوق کو واپس دلانے اور اپنے پیارے وطن کو کروڑوں کسانوں، مزدوروں، کلرکوں، طالب علموں استادوں اور ادیبوں کے لیے ایک جنت بنانے کو وقف کر دیا ہے۔ ارتقا کا الٰہی قانون اپنا فیصلہ سنا چکا ہے اور اس موقع پر عوام دشمن عناصر کی گھبراہٹ فطری بھی ہے اور بیکار بھی۔ (رسالہ نقوش (۶)، لاہور)

ضمیمہ ۶

منشور

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان ۱۹۴۹ء

آج ہمارے ادب میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ترقی پسند اور رجعت پسند ادبی رجحانات زیادہ صفائی اور شدت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس کشاکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو پاکستان کے محنت کش، مزدور کسان، ادیب، دانشور، صحافی، طالب علم، دفتری کلرک اور دوسرے مظلوم طبقے۔ سرمایہ داری اور جاگیری نظام کو توڑ کر اس کی جگہ جمہوری اور اشتراکی نظام قائم کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔

پاکستان کو وجود میں آئے دو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، اس عرصے میں ہمارے حکمرانوں کے تمام دعووں اور وعدوں کے باوجود پاکستان کے محنت کشوں کی حالت بہتر ہونے کے بجائے اور خراب ہوئی ہے، پیداوار گھٹ رہی ہے، لوگوں کا معیار زندگی گرتا جا رہا ہے، بے روزگاری، مفلسی اور بیماری بڑھ رہی ہے اور آمدنی کم ہو رہی ہے، اخبار اور رسالے بند ہو رہے ہیں، اُن کے پڑھنے والوں کی تعداد گر رہی ہے، ادیب اور فن کار پریشانیوں میں مبتلا ہیں، مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم کا معیار اور پست ہو گیا ہے، مادی زبوں حالی کے ساتھ تہذیب کے چشمے بھی سوکھ رہے ہیں، البتہ سرمایہ داروں، نوابوں، جاگیرداروں، مل مالکوں اور دوسرے غیر تخلیقی عناصر کی لوٹ کھسوٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، سرکاری محکموں میں رشوت ستانی اور کنبہ پروری اور انصاف کشی عام ہے، ملک کا زیادہ روپیہ تخریبی کاموں مثلاً جنگی تیاریوں پر صرف ہو رہا ہے اور بہت کم تعمیری اور تہذیبی کاموں پر۔ حکومت سوسائٹی کے غیر تخلیقی عناصر کے مفاد کی حفاظت کرتی ہے اور محنت مشقت کر کے ملک کی دولت پیدا کرنے والوں کے حقوق اور مطالبات کو پامال کرتی ہے۔

ہمارے حکمرانوں نے پاکستان بننے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان ایک آزاد جمہوری ملک بنےگا۔ انھوں نے اپنے سب وعدے بھلا دیے ہیں اور بڑی ڈھٹائی سے اینگلو امریکی سامراجی بلاک میں شامل ہو گئے ہیں، وہ پاکستان کی رائے عامہ کو ٹھکراتے ہوئے، پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ میں شریک کیے ہوئے ہیں، امریکہ، برطانیہ اور دوسری سامراجی طاقتیں، سوویت یونین، مشرقی یورپ کی جمہوری ریاستوں اور جمہوریہ چین کے خلاف جو جنگی تیاریاں کر رہی

ہیں ہمارا حکمران گروہ اُن کی حمایت کررہا ہے۔ایٹم بم کو برباد کرنے اور اسلحہ جات جنگ میں کمی کرنے کی جو معقول تجویزیں سوویت یونین کی طرف سے پیش ہوتی ہیں، ہمارے ارباب اقتدار ان تجویزوں کی مخالفت میں امریکہ کا ساتھ دیتے ہیں، وہ محکوم ملکوں کی جنگ آزادی کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔لیبیا، انڈونیشیا، ویت نام، کوریا، یونان، صومالی لینڈ اور برّ اعظم جس ملک میں بھی عوام اپنے غدار حاکموں اور اینگلو امریکی سامراجیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں تو ہماری حکومت سامراجی طاقتوں کا ساتھ دیتی ہے، ہماری فوج اور ہوائی اور بحری بیڑے کی کمان اب تک انگریز جنرلوں کے ہاتھ میں ہے۔ ملک کی بعض کلیدی آسامیوں پر بھی انگریز ہی مسلط ہیں، اسٹرلنگ بلاک کے اندر رہ کر ملک کی معاشیات کو اینگلو امریکی سامراجی مفاد کا پابند کردیا گیا ہے، ملک کو صنعتی بنانے کے تمام منصوبے میز کی درازوں میں بند کردیئے گئے ہیں، اینگلو امریکی سرمائے کو پاکستان میں آنے اور ہماری قومی دولت کو لوٹنے کی دعوت دی جارہی ہے، ملک کی زرعی زندگی درھم برھم ہورہی ہے، جاگیری نظام بدستور قائم ہے اور دیہی زندگی کو سرمایہ داری نظام کے شکنجے میں کسا جارہا ہے، اس نظام میں زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں...... آرٹ، ادب، حسن ومحبت، اخلاق، مروت اور انسانیت...... بازاری جنس بن گئی ہیں، آدمی آدمی کا غلام ہے، انسان اپنے جمالیاتی ذوق کو تربیت دینے سے محروم ہے، اس کی شخصیت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور نہ اس کی تخلیقی اور فنی صلاحیتیں ترقی کرسکتی ہیں، تہذیب کی تمام نعمتیں مٹھی بھر مفت خوروں کا اجارہ بن گئی ہیں، زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے زندگی کی تگ ودو اور اس کے ارتقائی عوامل کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے وطن کے اس معاشی زوال اور تہذیبی اور تمدنی انحطاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں انگریز سامراجیوں کے زمانے کا نیم نوآبادیاتی اور فرسودہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام ابھی تک قائم ہے، پاکستان کے تمام محنت کش آج اسی فرسودہ نظام کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں، یہ جدوجہد روز بروز زیادہ شدید ہوتی جارہی ہے، وہ لوگ بھی جنہیں حکمران طبقے اور اس کی سیاسی تنظیم کی جانب سے خوش فہمیاں تھیں، اپنے تجربے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ اس سماجی نظام کو بدلے بغیر ہماری حالت نہیں سدھر سکتی۔اس جدوجہد کو کچلنے کے لیے اربابِ اقتدار، جن کا مفاد اس سماجی نظام کی بقا سے وابستہ ہے سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈیننس نافذ کرتے ہیں، ہم کو ہمارے انسانی اور جمہوری حقوق سے محروم کرتے ہیں۔ زبان اور قلم پر پہرے بٹھاتے ہیں اور جمہوریت پسند رسالوں اور اخباروں کو بند کرتے ہیں اور ان سے ضمانت طلب کرتے ہیں۔جمہوری کارکنوں کو ہزاروں کی تعداد میں بلا کسی جرم کے گرفتار کیا جاتا ہے لیکن ان تمام سختیوں کے باوجود ملک کی جمہوری تحریک برابر ترقی کررہی ہے، سچی آزادی کی جنگ بدستور جاری ہے۔

جنگ آزادی کے اس نئے دور میں ہمارے ادب میں بھی دو رجحانات صاف دکھائی دے رہے ہیں، ایک طرف وہ ادیب اور فنکار ہیں جو پاکستان کے حکمراں گروہ کے ظلم وتشدد کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، جو سچی آزادی، امن، جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں، جو پرانے ادیب کی جمہوری روایات کو

آگے بڑھاتے ہیں، جن کی تحریروں میں زندگی کی تڑپ ہوتی ہے، جن کی نگارشیں محنت کشوں کے قوائے عمل کو حرکت میں لاتی ہیں، ان کے انقلابی شعور کو اور تیز کرتی ہیں، ان میں عزم، جرأت اور امید پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ادیب ہیں جو حکمراں طبقے کے اغراض و مقاصد کی ترجمانی کرتے ہیں، اس کے ظلم و تشدد کو سراہتے ہیں یا اس پر پردہ ڈالتے ہیں، جمہوری خیالات اور جمہوری تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں، پرانے ادب کی جمہوری روایات کو ابھرنے سے روکتے ہیں اور اپنی تحریروں سے لوگوں میں پست ہمتی، بے عملی اور ذہنی الجھاؤ پیدا کرتے ہیں۔

جو ادیب ان دونوں متصادم ادبی صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر تیسرا گروہ بنانا چاہتے ہیں، یا غیر جانبداری کا دعوی کرتے ہیں، یا ان دونوں گروہوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ دراصل عوام کو دھوکہ دیتے ہیں، رجعت پرست ادیبوں کی عوام دشمنی اور اپنی بزدلی اور مکاری کو چھپانا چاہتے ہیں۔ عوام کے دشمن ادیبوں کے ساتھ یعنی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے نقارچی ادیبوں کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

پاکستان میں رجعت پرست ادیبوں کے کئی گروہ پائے جاتے ہیں، ایک گروہ ''ادب برائے ادب'' والوں کا ہے جن کو کسی خیال کے اچھے یا برے، مفید یا مضرت رساں ہونے سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ خیال، وہ کتنا ہی زہریلا خیال کیوں نہ ہو، ادا کس طرح کیا گیا ہے، وہ معنی اور اسلوب کو الگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح معنی اور اسلوب کی نامیاتی وحدت کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں، ادب برائے ادب کا راگ الاپنے والے دراصل اس طبقے کے مفاد اور مقاصد کی حمایت کرتے ہیں جو موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدلنا نہیں چاہتا۔ ان کا یہ دعوی کہ ہم سماجی اور سیاسی مسائل سے الگ تھلگ رہ کر خالص ادب کا پرچار کرتے ہیں، جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔ طبقاتی سماج میں کوئی ادب، آرٹ اور علم طبقاتی جدوجہد کے اثر سے آزاد اور اس کی طرف سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، کیونکہ وہ خود ایک سماجی فعل ہے۔ ادیبوں کا یہ گروہ اپنے عمل سے اپنے دعوے کی تردید کرتا ہے۔ آج پاکستان میں ادب برائے ادب کے سب پرچارک پاکستان کے حکمران طبقے کے تنخواہ دار ڈھنڈورچی ہیں اور اس کی سماجی اور تہذیبی پالیسی کی تائید اسی شدت سے کرتے ہیں، جس شدت سے دوسرے رجعت پرست ادیب کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان نام نہاد ''پاکستانی ادیبوں'' کا ہے، جو اپنی تحریروں میں انتہائی گھناؤنی اور زہریلی قسم کی وطن پرستی کی تبلیغ کرتے ہیں، دراصل انھیں پاکستان سے محبت بھی نہیں، جب وہ ''پاکستانی ادب'' کا نعرہ لگاتے ہیں تو ان کی مراد اس ادب سے نہیں ہوتی جس میں پاکستان کے پچانوے فی صدی عوام کی کلفتوں اور خواہشوں کا تذکرہ ہو، بلکہ ان کی مراد اس ادب سے ہوتی ہے جس میں پاکستان کے برسراقتدار طبقے کی نام نہاد قومی خدمات کو سراہا گیا ہو، یعنی ان کے ظلم و تشدد پر پردہ ڈالا گیا ہو، جب یہ فاشسٹ ذہنیت رکھنے والے ادیب پاکستان سے وفاداری کا دعوی کرتے ہیں تو ان کا مطلب ہوتا ہے پاکستان کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوابوں اور دوسرے جمہوریت دشمن عناصر سے وفاداری، نہ کہ پاکستان کے

محنت کشوں سے اور ان کی جدوجہد سے وفاداری، یہ ادیب ہندوستان کے سرمایہ داروں اور ہندوستان کے محنت کشوں میں کوئی فرق نہیں کرتے بلکہ ہندوستان کے عام لوگوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہاں کے عوام اپنی جدوجہد سے غافل ہو جائیں اور مسائل حیات سے منہ موڑ لیں۔ یہ ادیب ہمارے دشمن ہیں، کیونکہ وہ پاکستان کے محنت کشوں کے جذبہ حب الوطنی کو برسراقتدار طبقے کی خودغرض سیاست کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو اسلامی ادب کے نام پر رجعت پرستی کا پرچار کرتے ہیں، دراصل ان ادیبوں کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں، انہیں انسان کی روحانی قدروں سے اور اخلاقی اصولوں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں، وہ خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل بھی نہیں کرتے، یہ رجعت پرست ادیب لوگوں کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں، جو کام پاکستان کے سرمایہ دار حکمران ان دنوں اسلامی نظام اور اسلامی ادب سے لینا چاہتے ہیں، یعنی اسلام کی آڑ لے کر سرمایہ داری نظام کی خرابیوں پر پردہ ڈالنا اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے لوگوں کو یہ باور کرانا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ یہ ادیب ایسے رجعت پرست تصورات کی تلقین کرتے ہیں جن سے لوگوں میں ذہنی الجھن پیدا ہو، اور ان کا دھیان آج کل کے اصلی اور بنیادی مسئلوں کی طرف سے ہٹ جائے، مثلاً لوگوں کو صبر وشکر اور قناعت وتوکل کی تعلیم دی جاتی ہے، فقر و فاقہ کے روحانی فائدے بیان کیے جاتے ہیں، قلندری اور درویشی کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے، مادی ضرورتوں سے مستغنی ہو کر روحانی ترقی کی باتیں کی جاتی ہیں، سائنس اور سائنٹیفک طرز فکر کی مخالفت کی جاتی ہے، عقل کو عیار بتایا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ موجودہ حالات بدلے نہیں جا سکتے، یہ انتہائی نقصان دہ تحریک ہے، اس سے ہماری جمہوری تحریک اور حالات کو بہتر بنانے کی عوامی جدوجہد کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہم اس کے خلاف پوری مستعدی سے جدوجہد کریں گے۔

پھر وہ ادیب ہیں جو فرائڈ اور دوسرے بورژوا ماہرین نفسیات کے تتبع میں نفسیاتی موشگافی کے کرتب دکھا کر اور انفرادیت پرستی کی تلقین کر کے لوگوں کو اس دھوکے میں مبتلا کرتے ہیں کہ ہماری پریشانیوں اور تکلیفوں کا باعث موجودہ سماجی نظام نہیں بلکہ ساری خرابی ہمارے ذہن کی ہے، یہاں ان فحش نگار اور عریاں نویس ادیبوں کا ذکر بھی ضروری ہے، جو آج کل کے جنسی تعلقات اور جنسی اخلاق کو موجودہ سماجی پس منظر سے الگ کر کے دیکھتے ہیں اور محبت کے جذبے کی توہین اور تذلیل کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جو بحران ان دنوں سرمایہ داری نظام پر طاری ہے وہ اس سماجی نظام کے نقارچیوں کے ادب میں بھی پایا جاتا ہے، ان کا ذہنی انحطاط اور ان کی ذہنی پراگندگی ان کی تحریروں میں صاف جھلکتی ہے، اور وہ کسی عظیم ادب کی تخلیق سے قاصر ہیں، کیونکہ وہ انسان سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے حال اور مستقبل پر بھروسہ نہیں کرتے، اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی خواہشوں، کلفتوں اور مسئلوں کی ترجمانی نہیں کرتے اور نہ اس کی جدوجہد کو اپناتے ہیں۔ ان کی

اساس فکر، ان کا موضوع سخن، ان کا اسلوب بیان، ان کے کردار سب ان کی انسان دشمنی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے ہیرو ڈاکو، لٹیرے، قاتل، غنڈے اور اسی قبیل کے وہ تمام لوگ ہوتے ہیں، جو سماج کے کسی تخلیقی کام میں حصہ نہیں لیتے۔ ان پر قنوطیت طاری ہے۔ وہ موت کے گیت گاتے ہیں۔

غرض اس گروہ کے تمام ادیبوں کا ادب مکاری، جھوٹ اور دغا بازی کا ادب ہے، انسانیت، جمہوریت اور امن کے دشمنوں کا ادب ہے، عوام سے غداری کرنے والوں کا ادب ہے، پست ہمتی، یاسیت، وہم پرستی اور اخلاقی پستی کی تلقین کرنے والوں کا ادب ہے، ان لوگوں کا ادب ہے جو انسان کو آگے لے جانے کے بجائے پیچھے لے جانا چاہتے ہیں، ہمارا حکمران طبقہ ان ادیبوں کو سراہتا ہے اور ان کی رجعت پرست تحریروں کی ہمت افزائی کرتا ہے، کیونکہ اس قسم کی تحریریں اس طبقے کی سیاسی اور تہذیبی اقدار کو برقرار رکھنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

اس کے برعکس ہم ترقی پسند ادیب ادب کو زندگی کا آئینہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کو بدلنے اور بہتر بنانے کا ذریعہ اور وسیلہ بھی تصور کرتے ہیں، ہم ادب برائے زندگی، ادب برائے جدوجہد اور ادب برائے انقلاب کے نظریے کو اپنی تحریک کا سنگ بنیاد خیال کرتے ہیں، ہماری فکری اساس اشتراکی حقیقت پسندی پر ہے، ہم اس تضاد کو مٹانا چاہتے ہیں جو آج ہمارے سماجی نظام اور عام انسانوں کی ضرورتوں کے درمیان پایا جاتا ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے ہماری سماج کی اور اسی کے ساتھ ہمارے آرٹ اور تہذیب کی ترقی رک گئی ہے، ہمارا نصب العین ایک ایسے نظام زندگی کو قائم کرنا ہے جس میں ہم میں سے ہر شخص کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تربیت کا موقع مل سکے، ہماری تخلیقی اور فنی صلاحیتیں ابھر سکیں اور ہم اپنی شاندار تہذیبی روایات کو فروغ دے سکیں، زندگی آلام و مصائب سے پاک ہو، زیادہ حسین اور زیادہ صحت بخش ہو، یعنی ہم صحیح معنی میں آزاد ہوں، یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم موجودہ سرمایہ داری جاگیرداری نظام کو توڑ کر محنت کشوں کی قیادت میں ایک عوامی جمہوری نظام قائم کریں، جو اشتراکی معیشت کی تعمیر کرے۔

آج ہم بڑے فخر کے ساتھ اس بات کا اعلان کر سکتے ہیں کہ پچھلے پندرہ برس کے اندر ہم نے اپنے ادب میں اپنے وطن کی جنگ آزادی کے ہر نئے موڑ کو پیش کیا ہے اور ہر جمہوری تحریک کو اپنایا ہے۔ ہم سے پہلے ادیبوں کی ایسی کوئی جماعت نہیں تھی جس نے منظم طور سے ملک کے محنت کشوں اور مظلوموں کی جدوجہد میں ان کا ہاتھ بٹایا ہو، ہم ملکی غلامی کے خلاف لڑتے رہے، ہم عوامی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، کیونکہ ہم عوام میں سے تھے اور ہمارا مفاد ان سے وابستہ تھا۔ ہم سے پہلے ادیبوں کی ایسی کوئی تحریک نہ تھی جس نے سوچ سمجھ کر مزدوروں، کسانوں اور دوسرے دبے ہوئے طبقوں کی زندگی کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہو، ہمارے سوا آج بھی ملک میں کوئی ادبی تحریک نہیں جو منظم طور سے انسانی برادری، انسانی حقوق، قوموں کے حق خود اختیاری، عورتوں کی مساوی حیثیت اور ان کی مکمل آزادی، جمہوریت، امن اور انصاف کی خاطر جدوجہد کر رہی ہو، جو ہر قسم کے مابعد الطبیعیاتی اور احیائی خیالات کے خلاف لڑ رہی ہو اور جو تمام نظریوں کو عقل اور سائنس

کی کسوٹی پر پرکھتی ہو۔

ہمارے دشمن ہم پر جانب داری کا الزام لگاتے ہیں، وہ کہتے ہیں، تمہاری تحریروں میں سیاسی رجحان پایا جاتا ہے، ہمیں اس کا اعتراف ہے۔ ہم حیات اور موت کی جنگ میں جانب دار ضرور ہیں، ہماری تحریروں میں جمہوری رجحان پایا جاتا ہے، اور ہم سچائی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں، ہمیں اس بات پر فخر ہے، کیونکہ ہماری اس جانب داری، اس رجحان، اس پروپیگنڈے کا مقصد محنت کشوں کو آزاد کرانا ہے، بنی نوع انسان کو سرمایہ داری اور جاگیرداری کی غلامی کی لعنت سے نجات دلانا ہے، ایک غیر طبقاتی متمدن سماج کی تعمیر کرنا ہے، ادب کا اس سے بہتر استعمال، اس سے اعلیٰ مقصد اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ہم ترقی پسند ادیب اپنی قدیم تہذیب اور ادبی روایات کے صحیح وارث ہیں، ہم نہ صرف ان سے مستفید ہوتے ہیں بلکہ ان کو اور آگے بڑھاتے ہیں، البتہ ہم احیاء پرستی کے بجائے اپنے تہذیبی ورثے کو تنقیدی نظر سے پرکھتے ہیں، اسی کے ساتھ ہم تمام دنیا کے ترقی پسند اور جمہوری ادب سے بھی اپنے ناقابل شکست اتحاد کا اعلان کرتے ہیں۔

ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنے قومی اور ادبی فرائض کو حتی المقدور سرانجام دیں گے، ہم اپنے عمل اور اپنے خیال اور اپنی ادبی تخلیق پر کڑی تنقید کریں گے اور ہر قدم پر اپنے آپ سے یہ سوال کریں گے کہ ہم کس کے لیے لکھتے ہیں، ہمارا مقصد کیا ہے اور زندگی اور موت کی اس جدوجہد میں جو آج ہر محاذ پر جاری ہے، ہم کس کے ساتھ ہیں؟

سرمایہ دار تہذیب دم توڑ رہی ہے لیکن آج بھی اس کے تہذیب کش اور امن سوز منصوبے ہماری زندگی کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں، دنیا بھر کے سرمایہ دار، سامراج اور جاگیرداران دنوں جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں ایسی حالت میں ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کے محنت کشوں کو سامراجی جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات سے آگاہ کریں اور اپنے وطن کے جنگ باز عناصر کی سازشوں کو بے نقاب کریں، آج امن کی جدوجہد، آزادی اور جمہوریت اور انسانیت کی جدوجہد کا ایک جزو بن گئی ہے، اس جدوجہد میں امن پسند قوتوں کا پلہ بہت بھاری ہے۔ ان کی صفوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اس جدوجہد میں ہمیں اپنی ہمسایہ اشتراکی ریاست سوویت یونین کی رہنمائی حاصل ہے، سوویت یونین آج امن کا سب سے بڑا محافظ ہے، کیونکہ اشتراکی نظام صلح پسند اور تعمیر پسند نظام حیات ہے، ہمارے ساتھ جمہوریہ چین کے سورما ہیں، جنھوں نے جنگ باز امریکی سامراج اور اس کے حاشیہ بردار چینی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو زک دی ہے، ہمارے ساتھ مشرقی یورپ کی جمہوری ریاستیں ہیں اور دنیا کے کروڑوں مزدور اور کسان اور دوسرے امن پسند عوام ہیں۔ اس جدوجہد میں جیت ہماری ہوگی!

پاکستان کے حکمرانوں کی معاشی اور سیاسی پالیسی کس طرح ہماری تہذیبی اور ادبی روایتوں کو پامال کر رہی ہے اور پاکستان کے محنت کشوں کو کس طرح علم و ادب کی برکتوں سے محروم کر رہی ہے اور سیفٹی ایکٹوں اور آرڈیننسوں کے ذریعے کس طرح اظہار خیال کی آزادی ہم سے چھین رہی ہے۔ ہم اپنی تحریروں میں ان باتوں کو پوری صفائی سے بیان

کریں گے، ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم لوگوں میں سرمایہ دارانہ سماجی نظام سے نفرت پیدا کریں گے، ہم اپنے ادب کو پاکستان کے عوام کی ہر چھوٹی بڑی جمہوری جدوجہد کا نقیب اور ترجمان بنائیں گے۔

ہم اپنے نصب العین پر بے باکی سے قائم رہیں گے اور ترقی پسند ادب کے دشمنوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کریں گے اور نہ ان کے ساتھ کوئی اشتراک عمل کریں گے، تذبذب اور سمجھوتہ بازی سے ہماری ادبی تحریک کو سخت نقصان پہنچے گا۔

اب تک ہم نے مختلف قومیتوں کے ادب یعنی سندھی، پشتو، بنگالی اور پنجابی وغیرہ سے بڑی غفلت برتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ان زبانوں کے قدیم اور جدید ادب کو غور سے پڑھیں اور اس سے فیض حاصل کریں، ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم ان زبانوں کے ادیبوں کو اپنی تحریک میں شامل کریں گے اور ان زبانوں کی بقا اور ترقی میں حصہ لیں گے بلکہ عام لوگوں کے جذبات اور خیالات کو اور ان کی زندگی کے مسائل کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھ سکیں گے اور اپنی تحریروں میں پیش کر سکیں گے۔

ہماری ادبی کاوشیں ابھی تک صرف کہانیوں، ڈراموں، نظموں اور تنقیدی مضمونوں تک محدود رہی ہیں، ہمارے ادب کا دامن ابھی تک علوم جدید سے خالی ہے، سائنس، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، معاشیات اور اشتراکیت وغیرہ کے بارے میں ہم نے اب تک بہت کم لکھا ہے، اب تک ہم نے اپنے وطن کے قدیم آرٹ اور تہذیب کا باقاعدہ مطالعہ بھی نہیں کیا ہے اور نہ ان کی تنقید کے اصول مرتب کیے ہیں، ہم نے سائنسی اصول تنقید کی روشنی میں اب تک اپنے ادب کی تاریخ لکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ان موضوعات پر آسان زبان میں کتابیں اور رسالے لکھیں تا کہ عام لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔

عظیم ادب نے ہمیشہ انسان کے ضمیر کو جلا دی ہے، اس میں انسان سے محبت کرنے کا جذبہ ابھارا ہے، جو شخص انسان سے محبت نہیں کر سکتا وہ آرٹ سے بھی محبت نہیں کر سکتا، عظیم ادب نے ہمیشہ سماج کے ترقی پسند عناصر کے ساتھ رشتہ قائم کیا ہے، آج کے انقلابی دور میں عظیم ادب صرف محنت کشوں کی جدوجہد میں حصہ لے کر، ان کی امنگوں اور تقاضوں کو اپنا کر اور ان کی ترجمانی کر کے پیدا ہو سکتا ہے، آج انسان سے محبت کرنے کا اور اس کے آرٹ اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ ہم ادیب پاکستان کے محنت کشوں کی روزانہ کی جدوجہد میں، پاکستان کے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو توڑ کر اس کی جگہ عوامی جمہوری نظام قائم کرنے کی جدوجہد میں پوری طرح شریک ہوں تا کہ ہمارا ملک بھی جلد از جلد آزاد انسانوں کا ملک بن سکے، یہاں آرٹ اور تہذیب کے نئے سوتے پھوٹیں اور زندگی طربناک اور بھرپور ہو! (رسالہ سویرا، ۷، ۸۔ لاہور)

ضمیمہ ۷

انجمن کا نیا منشور

افسانہ خواں

عقب دیال سنگھ لائبریری' نسبت روڈ۔لاہور

۲ جون ۱۹۵۲ء

محترم و مکرم، تسلیم

انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی دوسری سالانہ کانفرنس ۱۲،۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو بمقام کراچی منعقد ہو رہی ہے، اس میں پاکستان کے وہ ادیب جمع ہو رہے ہیں جو ادب اور زندگی کے گہرے رشتے کے قائل ہیں اور فنی مقتضیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب کو انسانیت کے عروج وارتقا کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ادب سے آپ کی وابستگی واضح ہے اور مجھے یقین ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بنیادی ادبی مقاصد سے آپ کو ہمدردی ہے، میری درخواست ہے کہ آپ اس کانفرنس میں بطور مہمان شرکت کر کے انجمن کی عزت افزائی فرمایئے اور انجمن کے نئے منشور اور نئی ادبی پالیسی کے سلسلے میں کانفرنس کے مندوبین کو اپنے مشوروں سے نوازیئے۔

مجوزہ منشور کی ایک کاپی ارسال خدمت ہے، بفرض محال اگر آپ تشریف نہ لا سکیں تو اس منشور کے بارے میں آپ کے اظہار خیال اور کانفرنس کے نام آپ کے پیغام کا مجھے شدید انتظار رہے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ پہلی فرصت میں جواب سے ممنون فرمائیں گے، میں ۷ جولائی کو کراچی چلا جاؤں گا۔

مخلص

احمد ندیم قاسمی

جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان، لاہور

☆☆☆

مجوزہ منشور

(جو ۱۲، ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو بمقام کراچی دوسری کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کے سامنے بغرض منظوری پیش ہوگا)

گذشتہ سولہ برس میں ترقی پسند مصنفین نے اپنے ادب میں ملک کی معاشرتی زندگی کی انقلابی تبدیلیوں کا

بھرپور اظہار کیا ہے اور ادبی تخلیقات میں عقلیت پسندی، جمہوریت پرستی اور انسان دوستی کی روایات کو فروغ دے کر زندگی کو ارتقا کی منزلیں طے کرنے میں مدد دی ہے، آج اگر ہمارے ادب میں قنوطیت، مجہولیت، دقیانوسیت، مقدر پرستی اور زندگی کو فریب محض سمجھنے کے تصورات ختم ہو رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہمارے ادب نے زندگی سے قربت اختیار کی ہے اور اس میں زندگی کے ساتھ قدم جوڑ کر چلنے کا انداز نمایاں ہوا ہے تو یہ کارنامہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہی کا ہے۔

لیکن ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ آج بھی جاں بلب رجعت پسندی اپنے عرصہ حیات کو طول دینے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور ابھی تک ہمارے ملکی ادب میں وہ مہلک اثرات و رجحانات ایک حد تک نفوذ کیے ہوئے ہیں جو اگر ایک طرف قدیم جاگیردارانہ عہد کی ماضی پرستی اور پسماندگی کا نتیجہ ہیں تو دوسری طرف انسان کی حیوانیت جبلت اور یوگا کے نئے منفی فلسفوں کے پرتو اور فحش نگاری اور جنسی انتشار پسندی کے ترجمان ہیں، آج اگر ملک کے تمام باشعور ادیبوں نے ان خطرناک رجحانات کو بے نقاب نہ کیا اور زندگی کے نئے حسن اور بھرپور پن کی کماحقہٗ نمائندگی نہ کی تو ہمارا ادب نئے شکنجوں میں گرفتار ہو کر کھوکھلی روحانیت، بے بنیاد تصور پرستی، دقیانوسیت، غلط تاریخی واقعات اور ہیئت پرستی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین خالصۃً ادیبوں کی انجمن ہے۔ یہ ان تمام ادیبوں کا ادارہ ہے جو ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہیں اور متنازعہ فیہ مسائل کو اخوت، رواداری اور علم دوستی کے جذبے سے استدلال و مباحثہ کے ذریعے حل کرنے کے حق میں ہیں۔

ہماری انجمن صحت مند ادب کی تخلیق کے لیے ملک میں جمہوری اقدار کی نشوونما، استعمار دشمنی، عام خوشحالی اور صنعتی ترقی، عام تعلیم اور سائنس کی قدروں کی ترویج کو ضروری سمجھتی ہے اور اس امر پر یقین رکھتی ہے کہ عالمی امن کے مدعی ہوئے بغیر اور زندگی کے متعلق ارتقائی، رجائی اور تنقیدی نقطۂ نظر کی غیر موجودگی میں ادیب ملک و قوم کی یہ خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک ہمارے ماضی کے ادب کی بہترین روایات کا ایک تسلسل ہے جو اس زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ یہ انجمن ملکی تہذیب اور اپنے قدیم ادب کی جمہوری روایات کی وارث ہے لیکن تنقیدی نقطۂ نظر کے باعث ہم اپنے ماضی کے تمام ورثے کو ایک صحت مند تنقیدی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے پرکھنا لازمی سمجھتے ہیں کیونکہ اسی صورت میں ماضی کے ورثے سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم ادب میں تجربہ محض کے قائل نہیں لیکن ہر اس نئے ادبی تجربے کا خیر مقدم کرتے ہیں جو ہماری ادبی روایات اور زندگی کے نئے مطالبات سے ہم آہنگ ہو اور جس سے ہمارے ادب میں نئے پن پر مائیگی اور گہرائی کا اضافہ ہو۔

مجلس عاملہ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان

(پاکستان ٹائمز، لاہور)

ضمیمہ ۸

انجمن کے احیاء کے بارے میں استفسار

احمد ندیم قاسمی نے یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو ایک خط کے ذریعے پاکستان کے بڑے شہروں میں رہائش پذیر بیشتر سرکردہ ترقی پسند ادیبوں سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے بارے میں رائے مانگی تھی۔ اس پر حمید اختر، ظہیر کاشمیری اور صفدر میر نے ندیم صاحب کے اُٹھائے ہوئے اس سوال کا کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ فیض احمد فیض صاحب کا خط کتاب کے متن میں شامل ہے۔ یہاں ندیم صاحب کے نام باقی ماندہ خطوط میں سے سید سبطِ حسن اور مرزا ظفر الحسن کے خطوط کا متن پیش خدمت ہے۔

☆☆☆

برادرِ محترم سلام و نیاز

نظم ملی پھر آپ کی گشتی چٹھی۔ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔ نظم سالنامے میں شائع ہوگی۔ اُس کی ترتیب میں مصروف تھا اس وجہ سے خط لکھنے میں تاخیر ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تجدید کا خیال بہت مناسب ہے مگر شاید آپ کو معلوم ہو کہ چوہدری رفیق صاحب نے ایک انجمن اس نام سے قائم کر رکھی ہے۔ دو ڈھائی سال کا عرصہ گزرا ایک روز چوہدری صاحب مع حسن عابدی اور پروفیسر عتیق احمد صاحب تشریف لائے اور انجمن کی تجدید کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ قاسمی صاحب سے مشورہ کریں اور انجمن کے پرانے ادیبوں کی رائے بھی معلوم کریں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہم تو ابھی ابھی انجمن قائم کر کے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر مجھ سے مشورے کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال یہ باتیں تو پرانی ہوئیں۔ میری حقیر تجویز یہ ہے کہ آپ انجمن کے لیے کسی نئے منشور کا مسودہ تیار کرلیں کیونکہ آج حالات بہت بدلے ہوئے ہیں اور خود ان ادیبوں میں جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں بڑی ذہنی اُلجھنیں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ انجمن کا دامن کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہ ہوگا بلکہ اس میں مختلف خیالات کے اہلِ قلم شامل ہوں گے۔ پھر بھی کچھ بنیادی اصول اور اغراض و مقاصد تو ضرور ہوں گے مثلاً امن، جمہوریت، شخصی آزادی، تنقید و تزئین حیات وغیرہ جن کو وضاحت سے بیان کرنا ہوگا تا کہ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ آپ سے زیادہ اس کے لیے کون موزوں ہوگا۔ دوسرا مرحلہ کُل پاکستان کنونشن کا ہوگا۔ علاقائی زبانوں کے ادیب اپنی زبان اور ادب کے بارے میں جائز طور پر بہت حساس ہیں

لہٰذا ڈاکٹر عبداللہ اور وزیر آغا کی طرح اُردو کی جا و بیجا وکالت ترقی پسند ادب کی تحریک کے لیے نہایت مُضر ثابت ہوگی کیونکہ اس طرزِ عمل سے ادیبوں میں اتحاد و مفاہمت کے بجائے نفاق اور عداوت کا زہر پھیلتا ہے۔ آپ کو علاقائی تہذیبوں کے بارے میں بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا ہوگا (آپ سے میری مراد انجمن ہے)۔

اُمید ہے آپ ان معروضات پر ہمدردی سے غور فرمائیں گے۔

نیازمند

سبطِ حسن

۱۷ دسمبر ۷۵ء

☆☆☆

۲۱ دسمبر ۱۹۷۵ء

مکرمی قاسمی صاحب، آداب

آپ کا گشتی خط مورخہ یکم دسمبر ۱۹۷۵ء ملا۔ شکریہ ترقی پسند تحریک سے میری وابستگی بھی قدیم ہے۔ دکن میں قاضی عبدالغفار مرحوم اور مسز سروجنی نائڈو کی رہبری میں اور مخدوم کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالنے والوں میں راقم بھی شامل تھا اور سقوطِ حیدرآباد تک اس کی تمام سرگرمیوں سے میرا تعلق رہا ہے۔ وہاں کے اور دوسرے شہروں کے تجربے مجھے یاد ہیں اور ان ہی کو بنیاد بنا کر چند معروضات پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے ایک آدھ بات کام کی نکلے۔

تحریک اور تنظیم:

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ہر سطح پر اور زندگی کے اکثر شعبوں میں تحریک اور تنظیم کے معاملے میں فاش غلطیاں کی جاتی رہی ہیں۔ تحریک کو میں روح اور تنظیم کو جسم سمجھتا ہوں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ممکن نہیں۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ہر تحریک تنظیم کو جنم دیتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تنظیم کے بعد کسی تحریک کا ظہور نہیں ہوتا۔ پہلے تحریک اس کے بعد تنظیم۔ لہٰذا:

(۱) سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ''ترقی پسند تحریک ہے کیا؟'' آپ ہم جانتے ہیں کہ ''تحریک کیا ہے؟'' اور ''کیا نہیں ہے؟'' اس کے باوجود اس موضوع پر گزشتہ چالیس سال سے مستقل بحث ہو رہی ہے۔ مجھے حیدرآباد دکن میں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کا وہ اجلاس آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب فحاشی کے موضوع پر ایک قرارداد پیش کی گئی تو مولانا حسرت موہانی نے فحاشی کی تائید میں تقریر کی اور ہزار ہوٹنگ کے باوجود اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔ ہمیں اب ایک ''منشور'' مرتب کرنا چاہیے۔ یہ منشور پچھلے منشور کی نقل ہو یا کوئی موجودہ صورت۔ اس پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ منشور پر اتفاقِ رائے ہو جائے تو پتا چل جائے گا کہ آج ہم ترقی پسند تحریک کو کیا تصور کرتے ہیں اور کیا تسلیم نہیں

کرتے۔

(۲) جب ہم منشور پر متفق ہو جائیں تو پھر تنظیم کے مسئلے پر غور کریں جو میرے خیال میں منشور سے زیادہ کٹھن مرحلہ ہے۔ تنظیم کے سلسلے میں میری تجاویز یہ ہیں:

(الف) فی الحال صرف کراچی اور لاہور کو منظم کیا جائے۔ یہاں کی انجمنوں کو ٹھیک ٹھاک کیا جائے، دو سال کی سرگرمیوں کے تجربات اور مشکلات کا انتہائی غیر جذباتی ہو کر جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ ان دو شہروں میں تنظیم نے ترقی کی ہے یا نہیں۔ اگر ترقی حوصلہ افزا ہو تو پھر دو تین دوسرے بڑے شہروں میں شاخیں کھولی جائیں ورنہ انتظار کیا جائے۔

میں آپ کو کراچی کا حال سناتا ہوں۔ یہاں کی انجمن تین سال سے کام کر رہی ہے۔ پہلے سال کے پہلے اجلاس میں شرکاء کی تعداد پچیس تیس تھی۔ تین سال کے بعد بھی یہ تعداد اتنی ہی رہی یعنی وہی پچیس تیس۔ آپ کے ساتھ جو شام منائی گئی تھی اس کی تعداد سے آپ کو کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے۔ اس کثیر تعداد کا سبب تحریک نہیں بلکہ آپ کی ذات گرامی تھی۔ مجھے کراچی والوں سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ان کے پروگراموں میں کوئی تنوع نہیں ہوتا۔ ہر اجلاس میں ایک افسانہ، ایک غزل اور ایک نظم اور ان پر تین گھنٹے تک بحث۔ اس بحث میں جن خاص چار پانچ اصحاب نے تین سال پہلے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا آج بھی حصہ لے رہے ہیں--- باقی اصحاب محض سننے کے لیے آتے ہیں۔ انجمن کے جلسے غالب لائبریری میں ہوتے ہیں مگر میں شرکت نہیں کرتا کیوں کہ ایسے پروگراموں اور بیکار کی بحثوں میں فقط وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ یہ بات میں بار بار انجمن والوں کو بتا چکا ہوں۔ ان کی چند مجبوریاں ہیں جن پر وہ قابو نہیں پا سکے۔

(ب) کوئی تنظیم اس وقت تک کام یاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا اپنا دفتر، اپنی عمارت، نہایت مخلص اور بے لوث کارکنوں کی چھوٹی سی پلٹن اور کچھ فنڈ نہ ہو۔ ان سب کے حاصل کرنے کے کیا طریقے ہیں اس پر میں کوئی تجویز پیش نہیں کروں گا۔ کیوں کہ یہ بہت بڑے مسائل ہیں اور ان پر بھی غیر جذباتی ہو کر غور کرنا ہوگا۔ اور سب کو۔

(ج) کنونشن کی تجویز سے مجھے اتفاق ہے مگر اس کے انعقاد کا انحصار اسی پر ہے کہ کراچی اور لاہور کی تنظیمیں دو سال تک کیا کارگزاری دکھاتی ہیں۔

(د) ابھی سے یہ طے کرنا ہوگا کہ Mother Institution کا منصب کراچی کی انجمن کو دیا جائے گا یا لاہور کی انجمن کو۔ یہاں یہ سوال پیدا نہیں کرنا چاہیے کہ کراچی بڑا

شہر ہے اس لیے وہ اس منصب کا مستحق ہے یا لاہور علم و ادب کا قدیم اور عظیم گہوارہ ہے اس لیے لاہور اس کا حق دار ہے۔ اصول یہ ہو کہ جہاں فعال اراکین زیادہ ہوں وہاں کی انجمن کو Mother Institution قرار دیا جائے اور دوسرے شہر یا شہروں کی انجمنیں تابع اور شاخیں ہوں۔ مجھے کامل احساس ہے کہ یہ بھی کوئی آسانی سے طے ہونے والا مسئلہ نہیں ہے۔

(ھ) انجمن کی رکنیت پر بھی ابتدا ہی میں غور کر لینا ہوگا، رائٹرز گلڈ اتنی مدت سے قائم ہے۔ ہر دوسرے تیسرے سال الیکشن ہوتا ہے مگر آئینی نقطۂ نگاہ سے یہ سارے الیکشن بے قاعدہ ہیں کیوں کہ گلڈ کے ابتدائی دنوں میں جن اصحاب نے فیس ادا کی تھی انھیں سال ہا سال سے فیس ادا نہ کرنے کے باوجود رکن قرار دیا جاتا ہے حالاں کہ آئین میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ فیس ادا نہ کرنے پر رکنیت برقرار نہیں رہے گی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جب گلڈ والوں سے دریافت کرو تو جواب ملتا ہے ''مجبوری ہے کوئی فیس ادا ہی نہیں کرتا''۔ گلڈ کے آڈیٹر نے بتایا کہ ساری رقمی منظوریاں غیر آئینی ہوتی ہیں۔ کیوں کہ نہ گلڈ کی مجلس عام آئینی ہے نہ مجلس عاملہ اور نہ علاقائی شاخیں وغیرہ۔

یہ بالکل یقینی ہے کہ سال بہ سال رکنیت کا چندہ جمع نہیں ہوگا اور جب چندہ وصول نہ ہونے پر رکنیت ختم کی جائے گی تو خارج ارکان باغی ارکان ہو جائیں گے۔ کوئی تعجب نہیں جو وہ متبادل تنظیم بنا لیں۔ فیس کے بغیر بھی ہمارے دیکھتے دیکھتے لاہور کا حلقہ ارباب ذوق دو حصوں میں بٹ گیا۔

آخر میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا قومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہر کام بڑے پیمانے پر شروع کریں اور بہت سے بڑے کام کریں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کوئی چھوٹا کام بھی سلیقے اور شائستگی سے نہیں کر پاتے۔ یا تو پھوٹ پڑ جاتی ہے یا افلاس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میری تمام نیک تمنائیں ان بزرگوں اور نوجوانوں کے ساتھ ہیں جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جسم میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور میں ہر ممکنہ اشتراک کے لیے حاضر ہوں۔ فقط

مخلص

مرزا ظفر الحسن

دستاویزات

فتح محمد ملک: چند کتابیں

ادبیات	پاکستانیات
تعصبات	فکری تنگدستی اور نظریاتی بیگانگی کا موسم
اندازِ نظر	غلاموں کی غلامی
تحسین و تردید	خطہء خاک یا ارضِ پاک؟
اپنی آگ کی تلاش	فتنہء انکارِ پاکستان
خیال و خواب	پاکستان کا روشن مستقبل
اقبال فکر و عمل	چچا سام اور دُنیائے اسلام
اقبال فراموشی	**کشمیر اور فلسطین**
اقبال کے سیاسی تصورات	فلسطین اُردو ادب میں
فیض، شاعری اور سیاست	تحریکِ آزادیء کشمیر، اُردو ادب کے آئینے میں
احمد ندیم قاسمی، شاعر اور افسانہ نگار	کشمیر کہانی
ندیم شناسی	ن،م، راشد
احمد فراز: نغمہء دلدار یا شعلہء بیدار	
سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر	

◆◆◆◆◆◆◆

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
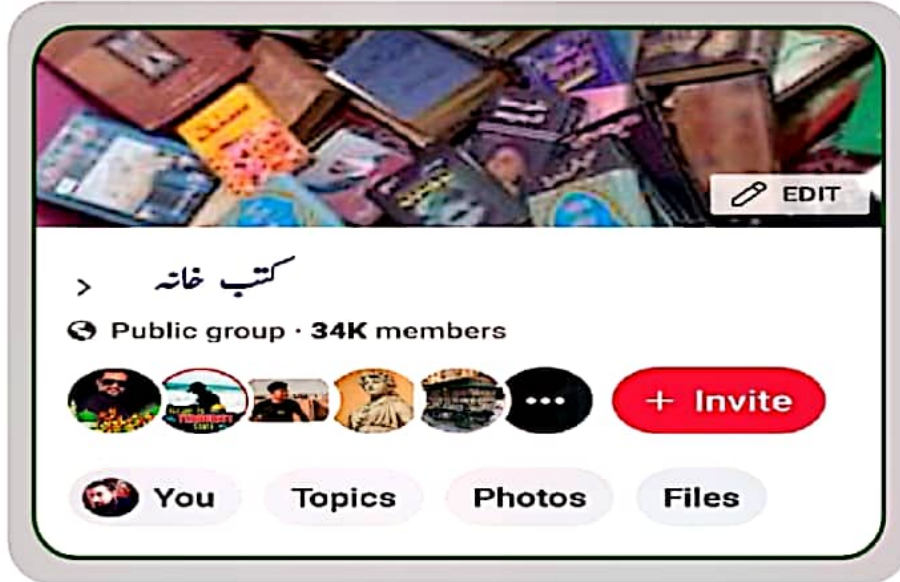
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

برطانوی ہند اور آزاد ہندوستان میں ترقی پسند ادب پر خوب دادِ تحقیق دی جا چکی ہے- میں نے اس ادبی تنقید و تحقیق سے اکتسابِ فیض کیا ہے مگر یہ احساس ہمیشہ دامن گیر رہا ہے کہ اس موضوع پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے اُس کا دائرہء کار بڑی حد تک لندن، لکھنؤ اور دیگر ہندوستانی مراکز تک محدود ہے- پاکستان میں ترقی پسند ادب ان کتابوں کا مرکزی موضوع نہیں ہے اس لیے قدرتی طور پر ان میں پاکستان کے آغاز کے چند ایک سال کے احوال و مقامات کے سرسری سے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے- یہی احساس میری اس کتاب کا محرک ہے-

آج یہ کتاب قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرتے وقت مجھے احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر ایوب مرزا بہت یاد آ رہے ہیں- میں نے ان کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی باتوں کی خوشبو سے بھی پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں کے مصائب و آلام کو اپنے دل میں اُتارا ہے-

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-2953-7
ISBN-13 978-969-35-2953-1